

گولڈن جوبلی ایڈیشن

جھوٹے روپ کے درشن

پنجاب یونیورسٹی کی مہکتی فضاؤں میں پروان چڑھنے والی محبت کی داستان

راجہ انور



WWW.PAKSOCIETY.COM

READING
Section

فہرست

- ۷..... جھوٹے رُوپ کے درشن ☐
- ۱۲..... دل کی بات ☐
- ۱۳..... یہ ہے راجہ انور ☐
- ۱۶..... محترمہ! مئی ۱۹۷۲ء ☐
- ۲۰..... لڑکی ۱۳ مئی ۱۹۷۲ء ☐
- ۲۳..... دیوی جی ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء ☐
- ۲۸..... دیوی جی ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۲ء ☐
- ۳۱..... جان جی ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء ☐
- ۴۱..... کنول ۱۰ نومبر ۱۹۷۲ء ☐
- ۴۳..... میری زندگی ۲ دسمبر ۱۹۷۲ء ☐
- ۴۸..... کنول ۸ دسمبر ۱۹۷۲ء ☐
- ۵۶..... دیوی رانی ۱۹ دسمبر ۱۹۷۲ء ☐
- ۶۱..... دیوی جی ۲۳ دسمبر ۱۹۷۲ء ☐
- ۶۵..... لڑکی یکم جنوری ۱۹۷۳ء ☐

- کنول ۵ جنوری ۱۹۷۳ء ۶۹
- رانی ۱۶ جنوری ۱۹۷۳ء ۷۲
- دیوی جی ۲۰ جنوری ۱۹۷۳ء ۷۷
- رانی ۲۳ فروری ۱۹۷۳ء ۸۰
- رانی ۲۸ جنوری ۱۹۷۳ء ۸۳
- کنول ۵ فروری ۱۹۷۳ء ۸۶
- دیوی یکم مارچ ۱۹۷۳ء ۸۸
- لڑکی ۱۲ مارچ ۱۹۷۳ء ۹۳
- میری زندگی ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء ۹۷
- لڑکی ۲ اپریل ۱۹۷۳ء ۱۰۲
- کنول ۱۱ اپریل ۱۹۷۳ء ۱۰۵
- راجہ صاحب ۱۴ اپریل ۱۹۷۳ء ۱۰۹
- راجہ صاحب ۱۹ اپریل ۱۹۷۳ء ۱۱۱
- راجہ صاحب ۲۲ اپریل ۱۹۷۳ء ۱۱۳
- راجہ صاحب ۲۶ اپریل ۱۹۷۳ء ۱۱۶
- راجہ صاحب ۲۹ اپریل ۱۹۷۳ء ۱۱۸
- راجہ صاحب ۲ جون ۱۹۷۳ء ۱۲۰
- راجہ صاحب ۱۵ اگست ۱۹۷۳ء ۱۲۳
- کنول ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء ۱۲۵
- بیگم صاحبہ ۱۷ اپریل ۱۹۷۳ء ۱۳۵

جھوٹے رُوپ کے درشن

احمد ندیم قاسمی

پاکستان نیشنل سینٹر میں ایک معروف طالب علم رہنما راجہ انور کی ایک تازہ تصنیف ”جھوٹے رُوپ کے درشن“ کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت صوبائی وزیر ملک مختار اعوان نے کی۔ راجہ انور کے مختلف احباب نے اُن کی شخصیت کے بارے میں بہت دلچسپ اور شگفتہ تقریریں کیں۔ میں نے اس کتاب کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی۔ جو کچھ میں نے عرض کیا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

راجہ انور کے بارے میں مجھے صرف اتنا علم تھا کہ وہ طالب علموں کا ایک باشعور رہنما ہے اور آتش بیان مقرر ہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد میں نے اُس کی کتاب ”بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک“ پڑھی تو مجھے معلوم ہوا کہ اُسے تحریری اظہار پر بھی قدرت حاصل ہے جس سے بیشتر ارباب سیاست محروم ہوتے ہیں۔ اب اُس کی دوسری اور تازہ تصنیف ”جھوٹے رُوپ کے درشن“ میرے سامنے ہے۔ اس کتاب کا مجموعی تاثر اُلیے کا ہے مگر میں اُس کی کرب انگیزی کا شکار ہونے کے باوجود خوش بھی ہوں اور میری اس خوشی کا ایک ٹھوس سبب ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے ابتدائی دنوں میں روایتی شعروادب کو رد کر دینے کے شوق میں نقادوں اور رہنماؤں کے ایک طبقے کی طرف سے معاملاتِ حسن و عشق کے اظہار کی مذمت کی گئی تھی اور یہ دلیل پیش کی گئی تھی کہ یہ صرف دولت اور وقت کی فراوانی کی کرشمہ سازی ہے اور اس عہد میں جب انسان کے لیے اپنے آپ کو عزت سے زندہ رکھنا ہی ایک مسئلہ ہے، حسن سے متاثر ہونا اور عشق میں مصروف رہنا رجعت پسندی اور زوالِ آمادگی ہے۔ شکر ہے کہ ترقی پسندی کا یہ معیار جلد باطل ثابت ہو گیا اور ثقہ

بند ترقی پسندوں نے محبت کو انسانی شخصیت کی تکمیل کا لازمہ قرار دیا۔ ترقی پسندانہ نظریہ حیات میں یہ اصلاح بحیثیت ادیب تو میرے لیے نہایت خوش آئند تھی مگر مجھے شبہ ہوتا تھا کہ ہمارے بعض انقلابی رہنما محبت کے جذبے سے محروم ہیں اور اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ انہوں نے کبھی محبت نہیں کی یا انھیں کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ چنانچہ چند برس پہلے جیل میں، پنجاب کے ایک بزرگ اور محترم انقلابی رہنما سے میں نے عرض کیا کہ آپ نے جب انقلابی سرگرمیوں میں اتنی مصروف زندگی گزاری ہے تو ظاہر ہے کہ آپ کو جوانی میں بھی کسی سے محبت کرنے کا وقت کہاں ملا ہوگا۔ انہوں نے پلٹ کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں نے اُن کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی ہے۔ پھر اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی۔ جو صرف اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب رو کے ہوئے آنسو پتلیوں پر پھیل جاتے ہیں۔ تب انھوں نے مجھے اپنی محبت کا ایک دل گداز واقعہ سنایا اور میرے دل میں اس انقلابی رہنما کی عزت اور بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص نظریاتی مشین نہیں ہے۔ محسوساتی مخلوق ہے۔ میرا یقین ہے کہ جو لوگ انسانوں کے جہلی اور ہنیادی جذبات کی قدر کرنا نہیں جانتے، وہ ادھر ادھرے لوگ ہوتے ہیں۔ چاہے وہ بہت بڑے مصلح ہوں، چاہے بہت بڑے انقلابی۔

راجہ انور کی تازہ تصنیف پڑھ کر مجھے اسی لیے خوشی ہوئی ہے نہ جانے مستقبل کے لیے اس نوجوان کے کیا ارادے ہیں۔ لیکن اگر اُس نے سیاسی لیڈر بننا پسند کیا تو یہ ایک ایسا لیڈر ہوگا جسے دیکھ کر نہ ہنسی آئے گی، نہ اُس سے ڈر لگے گا۔ بلکہ اُس پر پیار آئے گا۔ کیونکہ اُس نے بیمار کی تمام پرتوں اور مرحلوں کو، اپنے خون میں کھپا کر اپنی شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ بنالیا ہے۔

راجہ انور کی اس تصنیف کا مرکزی کردار خود راجہ انور ہے۔ یہ راجہ انور اپنی محبوبہ کی طرف سے سپردگی کی معراج سے لذت یاب ہونے کے فوراً بعد رد کر دیا گیا ہے۔ محبت کی تاریخ میں اس تضاد کا نتیجہ تین صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ خودکشی کی صورت میں، دماغی توازن کھو بیٹھنے کی صورت میں، یا بھری کائنات سے کلید مایوس ہو کر پوری زندگی ایک کلبی، ایک cynic کی طرح گزار دینے کی صورت میں۔ راجہ انور کی شخصیت نے ان تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت قبول نہیں کی۔ اُس نے ایک چوتھی صورت قبول کی ہے اور یہ نفی کی نہیں اثبات کی صورت ہے۔ یہ

شکستہ ریزوں کو چھنے اور جوڑنے کی صورت ہے۔ اور یہ وہ صورت ہے جو ایک ایسا نوجوان قبول کر سکتا ہے جسے انسان کی عظمت اور اُس کی آخری فتح پر یقین کامل ہو۔ مجھے یوں ہی ٹھہ سا ہوا کہ کتاب کے آخری باب، یعنی ۱۱۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء کے خط میں راجہ انور اس حد تک تلخ ہو گیا ہے جو اس کی شخصیت کی حد سے کچھ آگے کی حد ہے۔ اس کی شخصیت جو اس کتاب کے بیشتر حصے میں نمایاں ہوتی ہے، ابھرتی اور محبت کے روایتی معیاروں پر چھا جاتی ہے اس شخصیت میں محبت کے کرب نے گداز اور نرمی اور فراخ دلی پیدا کر دی ہے۔ یہ شخصیت اپنے رقب کو بھی دکھ پہنچانے کی روادار نہیں رہی۔ مگر اس آخری باب میں مصنف اپنی بے بس محبوبہ پر ٹوٹ ٹوٹ کر برسا ہے۔ حالانکہ اس بے بسی کے جواز میں ’کنول‘ کے خط کی یہ سطور پیش کی جاسکتی ہیں جو اس کتاب کا ایک حصہ ہیں کہ ”محسوس کرتی ہوں جیسے میں کسی غلط جگہ پیدا ہو گئی ہوں۔ اپنے ناموس کی خاطر اپنی اولاد کو ذبح کر دینا یہاں کا دستور ہے۔ میں ایک ناتواں عورت! ان سے کیسے لڑوں گی اور کب تک؟ میں تو یہی سوچ..... سوچ کر پاگل ہو جاتی ہوں۔ میرے پاس دعا اور انتظار کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔“

خود راجہ انور کو بھی شروع سے آخر تک اس سماجی تفاوت کی آگاہی حاصل رہی ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ اس سارے المیے کا اصلی مجرم وہ غیر ہموار اور غیر فطری معاشرہ ہے جس کے اصول محبت کرنے والوں کے درمیان ایک دھماکے کی طرح پھٹتے ہیں اور یکایک وہ آہنی فیصل ابھر آتی ہے جس کے دونوں طرف تنہا یوں کا سناٹا مسلط ہو جاتا ہے۔ راجہ انور کو بھی اس حقیقت کا علم ہے کہ اُس کی محبت کو طبقاتی امتیاز کی تلوار کی دھار پر رکھ دیا گیا ہے، مگر اُس کی مخاطب ’کنول‘ ہے۔ اس لیے وہ اسی کو زبردست طبع کی علامت قرار دے کر دھن ڈالتا ہے۔ شاید اس لیے کہ میں بُرائی نسل سے تعلق رکھتا ہوں، مجھے راجہ انور کے اس آخری خط کا لہجہ اُس کی پوری تصنیف کے لہجے سے مختلف اور اکھڑا اکھڑا محسوس ہوا ہے۔ اس کے بین السطور ”انتقام! انتقام!“ کی گونج سنائی دیتی ہے اور کتاب کا نام بھی اسی رد عمل کی کارروائی معلوم ہوتا ہے حالانکہ ہم بُرائے لوگ تو ان حالات میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کر لیا کرتے تھے کہ

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمھاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستہ غم ہو جاتے

مگر میں جانتا ہوں کہ راجہ انور کی نوک قلم کا حقیقی ہدف وہ معاشی اور معاشرتی نظام ہے جو محبت کی بے ساختگی اور سچائی کا کنٹرول دشمن ہے۔ اسی لیے تو راجہ انور نے کتاب کا انتخاب نئی نسل کے نام کیا ہے جو ہمارے دکھوں کا حساب چکائے گی اور کتاب کی آخری سطر بھی یہ ہے کہ ”باقی حساب ہماری نسلیں آپس میں طے کر لیں گی“۔ مگر میرا سوال پھر وہی ہے کہ جب یوم الحساب کا انعقاد نئی نسل کے سپرد کر دیا گیا ہے تو اس ’کنول‘ پر اتنی شدید طعنہ زنی کیوں، جو اس طبقے سے تعلق رکھتی ہے، جس کا حساب چکانا بھی باقی ہے۔

مصنف کے اس طرز عمل ہوا صرف اس حقیقت سے مل سکتا ہے کہ نوجوانی کا عالم ہے اور صدمہ مبالغے کی حد تک شدید ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہی شدید محبت کرنے والا نوجوان پوری کتاب میں نہایت متوازن انداز اختیار کیے رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے انسانی مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور انھیں اپنے اس دور کے تناظر میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر اس کے نظریہ اخلاق ہی کو لے لیجئے۔ کتاب کے آخر میں جب ایک طواف اٹا اے اپنا جسم پیش کرتی ہے تو وہ کہتا ہے ”نہیں۔ میں انسان کا گوشت نہیں کھا سکتا!“ ایک اور جگہ وہ اعلان کرتا ہے کہ ”میں محبت سے لے کر نفرت تک، کسی مقام پر بھی کسی کو دھوکا دینا جائز نہیں سمجھتا۔“ وہ مثنیٰ قسم کی آزادیاں جو آج کل کے بعض نوجوانوں میں بہت مقبول ہیں..... راجہ انور کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ ”ٹھیک ہے میں آزادی کا قائل ہوں، مگر چرس پینا بھی کوئی آزادی ہے؟ یہ تو ایسے ہی جیسے کوئی نہ کھائے اور کہے میں بغاوت کر رہا ہوں۔ چرس کے دھوئیں سے کیا سماج کے جاہل و نادان رشتے ٹوٹ جائیں گے! جب بڑے لوگوں کے بچے اسے حشیش کہہ کر پیتے ہیں تو مجھے اُن سے نفرت آتی ہے۔ یہ لوگ چرس اس لیے پیتے ہیں کہ مغرب میں آج کا دستور یہی ہے۔ صاحب لوگ بُرائی بھی ’ولایت پلٹ‘ کرتے ہیں۔ چرس پینا ہی اپنے لوگوں سے نیکہ لیتے تو کوئی بات بھی تھی.....“ یہ درست ہے کہ مصنف بھی کبھی کبھار دور بین کی مدد سے لڑکیوں کو نہاتے دھوئے اور کپڑے بدلتے دیکھ لیتا ہے، مگر خود اُسی کے لفظوں میں ”وہ ایک غیر روایتی کردار ہے۔“ اُس کے اپنے اخلاقی معیار ہیں اور یہ نہایت صاف ستھرے، منطقی اور خالصتاً انسانی معیار ہیں۔

جو کچھ ماضی میں ہو چکا ہے اور جو کچھ حال میں ہو رہا ہے، اس سے وہ برگشتہ ہے اور اس نظام حیات کو مقلوب کر دینا چاہتا ہے، جس میں نوجوانوں کے جذبات بھی محکوم بنا لیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بعض مسلمہ حقائق کو بھی مغالطے قرار دے ڈالتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ ”موسیقی بھی کتنا خوبصورت دھوکا ہے“ اور ”حسن ایک اضافی اور بے معنی شے ہے“ اور انسانی رشتوں کی ایک مروجہ اصطلاح ”بے وفائی“ کے بارے میں اُس کا کہنا ہے کہ ”بھائی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ انسان کسی کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جاتا..... بلکہ وہ ایک صورت حال سے دوسری میں چلا جاتا ہے.....“ اس آخری مغالطے کو ختم کرنے کی کوشش میں مصنف خود اس کی پیٹ میں آ گیا ہے اور اُس نے کنٹرول کی بے وفائی کا جواز مہیا کر دیا ہے۔ مگر یہ اُس زمانے کا ذکر ہے، جب اُن کی محبت عروج پر تھی۔ کتاب کا آخری باب لکھنے کے بعد راجہ انور کو اپنے اس نقطہ پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ مصنف کی محبت بھرپور ہے، جو کسی سے جھوٹ بولنا گوارا نہیں کرتی۔ کہتے ہیں کہ جنگ اور عشق میں سب جائز ہوتا ہے، مگر راجہ انور کم سے کم عشق کے معاملہ میں اس مفروضے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کے معیاروں کو عظمت اور پاکیزگی بخشتا ہے۔ عظمت اور پاکیزگی کے الفاظ میں نے بہت جھجک سے استعمال کیے ہیں، کیونکہ راجہ انور کو لفظوں سے بہت شکایت ہے۔ وہ تہذیب، شرم اور حیا کے لفظوں کو بانجھ الفاظ کہتا ہے۔ پھر ایک جگہ لکھتا ہے کہ ”لوگ بنجر الفاظ کے آہنگ سے یوں بہل جاتے ہیں جیسے بھوکا بچہ انگوٹھے سے۔“ اُس نے بعض دانشوروں کو ”مردہ الفاظ کے قبرستان میں بسنے والے گورکن“ قرار دیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے ”میں الفاظ کی دنیا سے بہت دور بہت پرے پہنچ چکا ہوں۔“ میں نے لفظ کے روایتی استعمال کے خلاف راجہ انور کی اس کھلی بغاوت کی قدر کرتا ہوں۔ اس نے معیار محبت کے ساتھ جو عظمت اور پاکیزگی منسوب کی ہے وہ اتنی روایتی نہیں ہے خود راجہ انور کی محبت کی طرح توانا اور با معنی ہے۔

(جنگ راولپنڈی ۱۳/مارچ ۱۹۷۷ء)

دل کی بات

انسان کی ساری تاریخ بھی جمع کر دی جائے تو محبت کی سائنس مرتب نہیں کی جاسکتی۔ محبت کی اس روئیداد میں مجھے موجودہ دھیان اور آنے والے جدید انسان کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہماری تاریخ بیداری کی ایک زبردست لہر سے گزر رہی ہے۔ نئے لوگ جنم لے رہے ہیں۔ نئی زبان وجود میں آ رہی ہے۔ دوسری جانب موت کا ایک رقص جاری ہے جس میں ایک پیار سا حسن بھی ہے اور بھیانک قباحت بھی۔ راجہ انور آنے والے دور کا نقیب ہے اور آج کے ایسے کا نمائندہ بھی۔ کنول زوال پذیر طبقے کی علامت ہے۔ وہ بھلا پیار کا مفہوم کیوں کر سمجھے گی۔ اس میں وہ روحانی وحدانیت ہی نہیں، جو بنیادی شرط ہے..... دل کو ایک پوری اکائی بنانے کے لیے..... محبت میں مبتلا ہونے کے لیے.....

زندگی اور موت بہت قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور بھی ہیں۔ اسی طرح راجہ انور اور کنول دراصل دو مختلف دنیاؤں کے بسنے والے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے جیسے وہ موت کے سرہانے کھڑی دنیا اور نئی محبتوں کے گیت الاپتا رہا۔ کنول یہ مدھر گیت سن ہی نہ سکتی تھی کیونکہ موت اندھی ہونے کے ساتھ ساتھ بہری بھی ہوا کرتی ہے۔

راجہ انور نے اپنی شخصیت کا پہلا بھرپور اظہار سیاست میں کیا۔ مصنف کی حیثیت سے ”بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک“ اُس کی پہلی تصنیف تھی جس میں اُس نے معاشرے کے رشتوں کو رد کر دیا تھا۔ آج بھی وہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ اُس کی زندگی کا یہ سارا عرصہ میرے سامنے ہے۔ جس میں ہم استاد اور شاگرد کی بجائے ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ زیرِ نظر مجموعہ کے پس پشت موجود ایسے کی بہت ساری جزئیات کا مجھے ایک دوست کی حیثیت سے علم ہے۔ وہ جس شدید کرب سے زندہ گزرا آیا ہے، یہ اُسی کا حوصلہ تھا۔

پروفیسر نصر اللہ ملک
گورڈن کالج، راولپنڈی
۷ مئی ۱۹۷۷ء

یہ ہے راجہ انور اعزاز احمد آذر

ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت سے متاثر اور بے نظیر بھٹو کے متاثرین میں شامل راجہ انور، پچھلے بہت سے برسوں کے دوران ایک افسانوی کردار کی حیثیت میں جانا جاتا تھا۔ ضیاء الحق کے عرصہ حکمرانی کے دوران اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق کبھی اسے کابل میں گولی سے اڑا دیا جاتا تھا، کبھی پھانسی کی سزا دے دی جاتی تھی اور کبھی انگلستان میں بجلی کی کرسی پر بٹھا کر سزائے موت دے دی جاتی تھی۔ اخبارات ہر دوسرے چوتھے روز اس کی موت کی خبر شائع کر دیتے، مگر کبھی یہ نہ ہوا کہ کسی اخبار نے پندرہ سولہ مرتبہ سزائے موت دینے کے حوالے سے اپنی کسی خبر پر معذرت کی ہو۔ خدا معلوم یہ خبر رساں ایجنسیاں تھیں یا کوئی اور ایجنسیاں۔ مگر پھر یوں ہوا کہ لوگوں کی دلچسپی راجہ انور کے حوالے سے بڑھ گئی۔

ریاست، سیاست، صحافت، ادب اور محبت راجہ انور کے پسندیدہ میدان اور موضوعات ہیں۔ ایک گہری Conviction اور واضح کمٹمنٹ کے ساتھ وہ ان موضوعات پر بات کرتا اور قلم اٹھاتا ہے۔ انسانی سماج کی بے چہرگی، بے سستی اسے تکلیف دیتی ہے۔ وہ اپنی فکر، اپنی سوچ اور اپنے قلم کے ذریعے اس بے سستی اور بے چہرگی کو ایک واضح رخ اور پہچان دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمارے سماج اور ہمارے نظام کی تہذیب ہو جائے۔ اس نے 8 دسمبر 1972ء کو ایک جگہ لکھا ہے کہ:

”اپنی سوسائٹی ان باتوں پر شرمندہ ہو جاتی ہے، جن پر نہیں ہونا چاہیے۔
لیکن ان باتوں پر قطعاً شرمندہ نہیں ہوتی، جن پر اسے شرمندہ ہونا چاہیے۔
مثلاً عورت اور مرد کا ملاپ، فطری حقیقت ہے اور اس حقیقت سے شرمانا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
 - ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
 - ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
 - ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
 - ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
 - ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
 - ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
 - ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
 - ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
 - ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
 - ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
 - ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
 - ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ایک غیر فطری رویہ ہے، لیکن رشوت، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور دولت کے انبار بغیر شرمائے ہی اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ ان بُرائیوں پر کوئی شرمندہ نہیں ہوتا۔“

(اقتباس از ”جھوٹے روپ کے درشن“)

راجہ انور کا قلم ہمہ جہت اور ہمہ صفت ہے۔ اس کی تحریر ”سجیدہ شگفتگی“ اور ”شگفتہ سنجیدگی“ کا ایک خوبصورت مرقع ہوتی ہے۔ اس کی کتاب ”جھوٹے روپ کے درشن“ اس کے دل، اس کے دماغ، اس کے عزائم اور اس کے ”طریقہ واردات“ کو سمجھنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ زمانہ طالب علمی اور عرصہ قیام ہاسٹل کے دوران یا ان حوالوں سے اب تک لکھی جانے والی کتابوں میں ”جھوٹے روپ کے درشن“ سب سے عمدہ کتاب ہے۔ یہ ایک طرف یونیورسٹی اور ہاسٹل کلچر کا منظر نامہ ہے، تو دوسری جانب نوجوانوں کے لیے ”ہدایت نامہ“ اور رہنما گائیڈ، ”قسم کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے۔

محترم قارئین! آپ تو جانتے ہیں، عیسائیت میں اپنے پچھلے گناہوں سے پاک ہونے کے لیے Confession کا طریقہ مروج ہے۔ جس میں متعلقہ شخص پادری کے سامنے اپنی بد اعمالیوں کا اعتراف کرتا ہے اور آئندہ ایک صاف ستھری زندگی گزارنے کا عہد کرتا ہے۔ ہمارے مسیحی دوست کنول فیروز نے بتایا کہ ایسا ہی ایک نوجوان اپنے ساتھ اخلاقی مدد کے لیے ایک دوست کو لے کر کنفیشن کے لیے پادری صاحب کے پاس حاضر ہوا۔ دوست کو باہر انتظار کرنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ کنفیشن کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے، پادری صاحب نے اُس نوجوان سے پوچھا ”اچھا تو کیا تم نے جن لڑکیوں سے دوستی کی اُن میں ریٹا تھی؟“ نوجوان نے پوچھا ”ریٹا کون؟“ پادری صاحب نے بتایا ”وہی، ڈیوڈ کی بیٹی، جو فلاں گلی میں رہتے ہیں۔“ نوجوان نے کہا ”نہیں سر! وہ نہیں تھی۔“ پادری صاحب نے پوچھا ”تو کیا مارتھا تھی؟“ نوجوان بولا ”مارتھا کون؟“ پادری صاحب بولے ”وہ جو جوزف کی بیٹی ہے، جن کے گھر کے سامنے پیری کا درخت ہے۔“ نوجوان نے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا ”تو کیا روزی سے تمھاری دوستی رہی ہے؟ جن کا کنٹرپر گرین گیٹ والا گھر ہے۔“ نوجوان نے پھر انکار کر دیا۔ پادری صاحب نے اسی طرح تین چار اور نام لیے مگر

نوجوان انکار کرتا رہا..... اور پھر پادری صاحب سے معذرت کر کے اور یہ کہہ کر..... کہ وہ پھر کسی وقت دوبارہ حاضر ہوگا۔ باہر چلا آیا۔ باہر بیٹھے دوست نے خوش ہو کر پوچھا، ”کیوں ابھی ہو گیا کنفیشن؟“ نوجوان نے کہا، ”کنفیشن کو گولی مارو۔ پانچ چھ ایڈریس اور مل گئے ہیں.....!!“

’جھوٹے روپ کے درشن‘ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے پڑھنے والے نوجوانوں کو وہی خوش ملتی ہے، جو کنفیشن والے اس نوجوان کو ملی تھی۔

(یہ مقالہ 1998ء میں ’جھوٹے روپ کے درشن‘ کی سلور جوبلی کے موقع پر پڑھا گیا۔)

محترمہ!

تم حیران تو ضرور ہوگی کہ اچھا بھلا چلتے پھرتے اس شخص کے دماغ میں کیوں فتور آ گیا ہے؟ سچ جانو میں خود اس 'کیوں' کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا ہوں۔ شاید اس کا جواب سرے سے ہے ہی نہیں۔ مجھے کہاں سے ملتا؟ پھر تمہیں کیسے دوں؟ یوں تو ہم دن میں کئی بار ملتے ہیں۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتی ہیں..... کسی نئے 'افئیر' سے لے کر..... ویت نام تک ہر موضوع پر گرم گرم بحثوں کی آندھیاں چلتی ہیں..... مگر تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ دنیا کے ہنگاموں سے بہت دور، میں نے کئی راتیں تم سے متعلق سوچتے سوچتے گزار دیں۔ ہر رات میں نے ہزاروں منصوبے باندھے..... اور آنے والی صبح نے ہر بار میرا حوصلہ چھین لیا..... تم سے اتنا بھی نہ کہہ پایا کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ بھلا، یہ بھی کوئی خوف کھانے والی بات تھی؟ میں نے خط کی بجائے، آج تم سے بات ہی کر لی ہوئی، مگر تمہاری سہیلی شاہدہ فوراً ہی آگئی..... اور وہ تمہارا ایسا سایہ ہے، جو اندھیرے میں بھی موجود رہتا ہے..... ہمیشہ کی طرح مجھے ضبط کرنا پڑا۔ سوچا اُس کے سامنے بات کروں تو تم کہیں بُرائی مان جاؤ..... دوسروں کی موجودگی میں اکثر اُن باتوں کو بھی بُرا فرض کر لیا جاتا ہے جنہیں لوگ، ویسے بُرا نہیں سمجھتے۔ ہم بھی کیا لوگ ہیں، بے جان روایتوں کے قبرستان میں دفن۔ تہذیب، شرم اور حجاب ایسے بانجھ الفاظ کے سحر میں گرفتار..... زندہ لاشیں!

اُن دنوں پورب (بنگلہ) پر بھنگی خان کی یلغار جاری تھی۔ اُلٹے ذہنوں پر مارشل لا کا وزنی پتھر ڈال دیا گیا تھا۔ ہم کوئی پچاس ساٹھ لڑکے شعبہ فلسفہ کے ایک کمرے میں بیٹھے، اس نازک سیاسی صورت حال کا تجزیہ کر رہے تھے۔ میں بحث سمیٹنے راستم پر پہنچا۔ ابھی بول ہی رہا تھا کہ تیز تیز آنکھوں، کئے بالوں اور متناسب قد و قامت کی ایک لڑکی، اپنے 'سائے' سمیت اندر آئی..... اُس

خوبصورت لمبے پھسلتے الفاظ کو میں بمشکل تھام پایا۔ ذہن میں تیزی سے خیال اُبھرا کہ کوئی راستہ بھٹک کر یہاں آن نکلا ہے..... پھر خواہش نے سر اٹھایا کہ یہ لڑکی اگر بھٹک کر ادھر آ ہی گئی ہے تو پھر تھوڑی سی اور بھٹک جائے..... اور وہ واقعی بھٹک گئی۔ وہ میرے سامنے بائیں ہاتھ والی قطار کے آخری سرے پر بیٹھ گئی۔ 'سایہ' بھی قریب ہی دوسری کرسی پر جم گیا۔ میں نے بھٹکتے خیالات کو یکجا کیا، اور دوبارہ الفاظ کی دنیا میں کھو گیا۔ کسی انتہائی جذباتی فقرے پر، نیم جان آنکھیں اُبھریں، تالیوں کا طوفان اُٹھا..... اور میں دم لینے کو پل بھر زکا۔ عین اس لمحے ایک جان دار نفرتی تہقہہ فضا میں لڑھکا۔ وہی لڑکی اپنے سائے سے کوئی بات کر کے کھلکھلائی تھی۔ خشکی کی حد تک سنجیدہ ماحول میں ہنسنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ قریب قریب سبھی نے اس تہقہہ کو محسوس کیا۔ چند پیشانیوں پر لکیریں اُبھریں، چند ویسے کے ویسے سر جھکائے بیٹھے رہے..... کچھ نے فوراً گردن پیچھے گھمائی کہ نفرتی ترنم بکھیرنے والی آبشار دیکھ سکیں۔ میں بھی تھوڑی دیر تک اس آواز کی صداقت میں ڈوب سا گیا۔ میں نے سوچا گھمبیر اداسیوں اور بوجھل دکھوں کے اس دور میں یہ لڑکی اتنی انمول خوشیاں اور بے ساختہ تہقہہ کہاں سے لائی ہے؟

اس لڑکی نے کانوں میں خاصے بڑے بڑے بالے ڈال رکھے تھے۔ بالکل میری ماں کے ایسے چاندی کے بالے..... جن سے کھیل کر میرا بچپن گزرا تھا..... میں نے ذرا غور سے دیکھا تو وہ مجھے کوئی ہندو دیوی لگی۔ یوں تو وہ خاصی ماڈرن تھی مگر اُس کے چہرے پر نظر نہ آنے والی کوئی ایسی جاذبت تھی، جو اُسے منفرد بنائے ہوئے تھی۔

میں یہ نہیں کہتا، میں بس اُسی لمحے گھائل ہو گیا تھا۔ تاہم ایک حد تک دلچسپی ضرور پیدا ہوئی..... کہیں دُور، اندر کسی کونے میں ہلکا ہلکا سا خمار چھایا۔ یہ ساری کیفیت محض حادثاتی تھی..... تمہارا نام جاننے کی حد تھا۔ بس یوں ہی سی، جو کسی بھی شخص میں، کسی بھی شاداب چہرے کو دیکھ کر اُبھرا کرتی ہے۔ قطعاً فطری سی، لمحاتی سی۔

پھر یونیورسٹی میں انٹیشن کا طوفان اُٹھا۔ ہر کونے سے ”سبز ہے“، ”سرخ ہے“ کے نعرے بلند ہونے لگے۔ تم اُن دنوں، سرخ دوپٹہ اوڑھے، سرخ پرچم تھامے، ہمارے جلوس کے آگے آگے..... چلا کرتی تھیں۔ ایک شام ہمیں انتخابی تقریریں کرنے لیڈرز ہاسٹل جانا تھا..... مخالف

نروپ کی لڑکیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ تم پیٹ پر ہاتھ رکھ کر پورے ”زور سے زندہ باد۔ آوے ای آوے“ کے نعرے لگا رہی تھیں۔ جلد ہی مخالف پارٹی دب گئی..... اور جلے پر تمھاری سہیلیوں کا قبضہ ہو گیا..... شاید میں اُسی زمانے میں تم سے متاثر ہوا..... اور پسندیدگی آہستہ آہستہ، چاہت کے بیٹھے بیٹھے درد میں بدلتی رہی..... ایک دن تم ایک لڑکے سے بہت خوش خوش گئیں لگا رہی تھیں۔ جانے مجھے کیوں اچھا نہ لگا؟.....

یہ سارے حادثات، ایک حادثے میں بدل گئے اور جب میں نے اس حادثے کو اپنی ذات کے رشتے میں جوڑا..... تو میں ننگا ہو گیا۔ مجھے پہلی بار اپنے وجود سے دہشت آئی..... ایک اجنبی سا احساس ہوا۔ ننگا ہو کر، انسان خوبصورت لگتا ہے، نہ بدصورت، بلکہ کچھ اور سا لگتا ہے..... عجیب سا..... ناقابل بیان سا..... اس ننگے پن نے مجھے اپنے ہونے کا احساس دیا اور اس دور خرابی میں ’ہونا بہت مشکل میں ہونا‘ ہے میری سرکار.....

میرا کزن بھی مجھے خراب کر گیا۔ ہم وقت میرے شعور پر تمھارے اچھا ہونے کے کچوکے لگاتا رہا..... پہلے تو میں سمجھا شاید وہ خود دلچسپی لے رہا ہے۔ اُس وقت تک بات پسندیدگی کی حد سے آگے نہ سرکتی تھی۔ میں خوش بھی ہوا کہ اس اکڑ کو بھی بالآخر کوئی پسند آئی گیا۔ اُسے تمھارا جامنی سوٹ بہت پسند ہے جس میں بقول اُس کے تم بہت اچھی لگتی ہو..... پھر اُس نے مجھے محسوس کرانا شروع کیا، وہ خود کچھ نہیں چاہتا بلکہ اُس کی خواہش ہے کہ میں تم سے بات کروں..... جانے کیوں؟ میرا کزن دنیا دار ہے۔ بے چارہ تمھارے جامنی سوٹ سے آگے نہ رینگ پایا۔ پر مجھے تو سب کچھ اُس کے برعکس لگا۔ جامنی رنگ تو اس لیے نکھرتا ہے کہ تم اسے پہنتی ہو۔ تمھارے وجود کے لمس سے آشنا ہوتا ہے..... ورنہ بے کار رنگ ہے..... محض بے جان..... اور..... بے نور.....

میرے پاس رکھا ہی کیا ہے جو میں تمھیں فخر سے پیش کروں۔ اپنی صورت سے لے کر دنیاوی دولت تک، ویرانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں میرے پاس! کس کو یہ ضرورت پڑی کہ میرے راکھ راکھ ماضی کو اپنائے، بے رنگ حال کو اپنے وجود کے لمس سے جامنی کر دے یا پھر اندھیروں سے زیادہ تاریک مستقبل میں میرے لیے چراغ راہ بنے۔ مجھے جن لوگوں نے جہنم دیا اُن کا اپنا کوئی ماضی تھا، حال ہے اور نہ مستقبل۔ مجھے کیا دیتے بے چارے؟ اُن کا کیا تصور کہ ان کو جہنم دینے

والے بھی اسی طرح بے حال اور کنگال ہوئے ہوں گے۔ میں انسان ہوں۔ صدیوں سے یوں ہی گم نام پیدا ہوتا چلا آیا ہوں۔ میرا مذہب، تاریخ اور نام مفلسی ہے..... میرے ہاتھ میں اپنے لہو بھرے کپڑے ہیں..... میری ساری کائنات بس اتنی سی ہے..... خلا کی بلندیوں پر بیٹھے خدا کے نام پر مجھے بار بار ذبح کیا گیا..... مگر مجھے اُس سے گلہ ہے نہ اُس کے بندوں سے..... میں تم سے کوئی چکر نہیں چلانا چاہتا..... اگر تمھاری مگنی وغیرہ نہ ہو چکی ہو تو شادی کے متعلق ذرا سوچنا..... مگر روایتی شادی نہیں۔

ہمارے یہاں شادی تو ایک جنسی کاروبار ہے۔ چھوٹے لوگ چھوٹی دکان سے اور بڑے، بڑی دکان سے جنس خریدتے ہیں..... زندگی سے بے بہرہ پروہت سمجھتا ہے، جیسے اُس کے جسنر منتر سے خریدی ہوئی جنس پوتر ہو گئی ہے.....

بھولے لوگ بنجر الفاظ کے آہنگ سے یوں بہل جاتے ہیں، جیسے بھوکا بچہ انگوٹھے سے! کون انھیں سمجھائے کہ بچہ پیدا کرنا تو مقدس فریضہ ہے..... پروہت نہ تھا تب بھی بچے پیدا ہوا کرتے تھے ورنہ ہم کہاں ہوتے؟ میں شادی کو ایک معاشرتی اعلان سمجھتا ہوں..... جو یونیورسٹی کے عین وسط میں کھڑے ہو کر بھی کیا جاسکتا ہے..... باقی سلسلے خرید و فروخت کے ہیں ان پر میں یقین نہیں رکھتا..... کہو کیا خیال ہے؟

جانتی ہو ایک بات نے مجھے ہمیشہ پریشان کیے رکھا۔ تم بہت بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ تم نے ہوائی جہاز کی سیٹوں اور ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں زندگی کاٹی ہے..... تمھارے لیے غم کی شدید ترین نوعیت، شاید کبھی کار کا خراب ہو جانا ہو۔ تمھیں معاشی طور پر کسی چیز کی کمی نہیں..... پھر تم کیوں ہم جیسے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے اجداد کے خلاف نعرے لگاتی ہو؟..... ہم سے تو ہماری انسانیت چھینی گئی ہے۔ زندہ رہنے کا حق مانگتے ہیں۔ تم سے کیا چھنا؟

جواب کی توقع رکھوں؟

تمھارا ساتھی

انور

نیوکیسپس پنجاب یونیورسٹی

۱۱۳ مئی ۱۹۷۲ء

۱۲۹- سرسید ہال

لڑکی

پرسوں شام پیغام آیا کہ ہاسٹل آکر تم سے ملوں۔ سچ جانو، وہ رات میں نے کروٹیں بدلتے گزاردی۔ خوشی اور خوف باہم دست و گریبان رہے۔ خوشی تھی کہ تم سے من وٹو کے سلسلے چھیڑیں گے اور خوف تھا کہ جانے کیا بنے؟

تمہارے آنے سے پہلے شاہدہ ملک نے مجھے تفصیل سے تمہارے متعلق بتایا کہ تمہاری مٹگنی تمہارے کزن سے ہو چکی ہے۔ وہ فوج میں مقرر ہے۔ مگر تمہارے من مندر کا دیوتا کوئی سی ایس پی ہے۔ پہلے یہیں پڑھا کرتا تھا۔ کسی بڑے خاندان کا خوش قسمت بیٹا ہے۔ تم چار بہنیں ہو، چھوٹی دونوں پڑھ رہی ہیں۔ سب سے بڑی کی شادی ہو چکی ہے۔ اب تمہاری باری ہے۔ تمہارے ڈیڈی ایک بڑے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ تمہارا کوئی بھائی نہیں، اس لیے وہ تم بہنوں کے متعلق بہت حساس ہیں۔ یوں بھی خاصے سخت مزاج ہیں۔ تمہاری پہلی مٹگنی ابھی نہیں ٹوٹی اور ہو سکتا ہے کہ تم ہی ایس پی کو بھی نہ پاسکو۔ سب کچھ تمہارے ڈیڈی کے موڈ پر منحصر ہے۔

جب تم آئیں، میں کوئی بات نہ کر پایا اور شاید کچھ کہنے کی گنجائش بھی نہ رہی تھی۔ اوپر سے تم اتنی نروس ہو رہی تھی، بمشکل تمہارے منہ سے ایک ادھورا سا جملہ نکلا ”میں بھی آپ کو بہت اچھا سمجھتی ہوں اور آپ کی عزت کرتی ہوں مگر.....“ اور میں تم دونوں کو خدا حافظ کہہ کر اٹھ آیا۔

اب مجھے یوں واپس آنے کا احساس ہو رہا ہے۔ جانے تم نے کیا سمجھا ہوگا؟..... تمہاری قسم، میں بالکل ناراض نہیں ہوں اور نہ تمہیں دل میلا کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔ کیا ہوا جو تم میری نہیں بن سکتیں، ہم دوست تو ہیں۔ یہی کیا کم ہے؟ اور پھر ضروری نہیں ہر خواب حقیقت میں

بدل جائے۔ میں محرومیوں کا زہریلی پی کر جوان ہوں تم اُجالوں کی باسی، میں تاریکیوں کا مسکن، تم فضاؤں میں گونجتا تھقہ، میں آہوں سے اٹھتا دھواں..... بھلا ملاپ کیسے ممکن ہوتا؟ میں دکھوں کا کشکول تھا مے جانے کب سے زندگی کی شاہراہ پر چل رہا تھا..... تمہارا بھلا ہو کہ تم نے اسے ایک ہی بار بھردیا۔ اب زندگی سکون سے کنتی رہے گی، پھر اپنوں کے دیئے دکھ تو بہت عزیز ہوا کرتے ہیں۔ میں تم سے صرف اتنی سی بات کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں میری ضرورت پڑے تو مجھے سرجھکائے اپنے ارد گرد ہی پاؤ گی۔

”اچھا سمجھئے“ کا شکریہ۔ میں بھی تمہاری بہت قدر کرتا ہوں۔ میں احسان فراموش نہیں۔ تم نے اس دیش کے مفلس بیٹوں کا پرچم تھاما۔ ایکشن والی رات، برستی گولیوں میں بھی تم ہمارے ساتھ تھیں۔ اس دنیا میں مجھ سے کہیں زیادہ محروم اور دکھی لوگ بستے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنانے کی خواہش تو کی، وہ غریب خواہش تک نہیں کر سکتے۔ ان سب کے لیے لڑتی رہنا۔ میں سمجھوں گا میں نے تمہیں پالیا ہے۔ چند لمحات کی زندگی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا۔

آج تمہاری جانب آنے کا پروگرام تھا۔ ابھی ہاسٹل ہی میں تھا کہ جھگڑے کی اطلاع ملی۔ میں اور رؤف (عطی) بھاگم بھاگ ڈیپارٹمنٹ پہنچے۔ آگے نقشہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ لائیاں اور فائرنگ..... کوئی گیارہ بجے پولیس نے یونیورسٹی کو گھیرے میں لے لیا..... ہمارے گروپ کے جاوید علی خان اور عارف راجہ بہت شدید زخمی ہیں۔ ابھی ابھی انہیں ہسپتال چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے اور وہاں پر موجود سبھی ساتھی پریشان تھے۔ کچھ اخبار نویس بتا رہے تھے کہ تمہارے شعبے میں جماعت اسلامی والوں نے لڑکیوں کو بھی ڈنڈے مارے اور کوئی دواڑ کیاں زخمی ہو گئی ہیں۔ خدا کرے تم خیریت سے ہو۔ میں نے کزن کو ہاسٹل دواڑا یا کہ وہ پتہ کر کے آئے اور ہاں، جماعت اسلامی کے بھی چار لڑکے ہسپتال میں پڑے ہیں۔

بہت ممکن ہے پولیس دونوں پارٹیوں میں سے کچھ لوگ گرفتار بھی کرے۔ خیر یہ کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اپنی زندگی میں ویسے بھی کیا حسن ہے جو جیل جا کر کھودیں گے۔

ویسے، خبر یہی ہے کہ ہنگامے کی وجہ سے یونیورسٹی ایک لمبے عرصے کے لیے ایک بار پھر چپ

کی چادر تانے گی۔ ہاسٹل بھی غیر معینہ مدت کے لیے خالی کرائے جائیں گے۔ اگر چٹھیاں ہو گئیں تو تمھارا کیا پروگرام ہے؟ میں تو ان حالات میں گھر نہیں جاسکتا۔ یہ خط تمھیں اپنے ایک دوست کے ہاں سے بیٹھا لکھ رہا ہوں..... میرا خیال ہے تمھیں کل تک مل جائے گا۔ چلو خیر، یونیورسٹی بند بھی ہو گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سوائے اس کے کہ تم کو نہ دیکھ سکیں گے۔

پیار

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

۱۳/ اکتوبر ۱۹۷۷ء

۱۲۹- سرسید ہال

دیوی جی

کتنا پیارا لفظ ہے مٹھاس سے بھرپور۔ جانتا ہوں میں نشو و نما ہوں۔ یہ مقدس لفظ میری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔ اگر ذرا سی اجازت ہو تو کبھی کبھار سرگوشی کے انداز میں دیوی جی کہہ کر بلا لیا کروں۔ آج کے تہذیب یافتہ دور میں ہم نشو و نما کو اتنی سی آزادی تو ملنی چاہیے۔

گرما کی چھٹیوں کا طویل زمانہ آخریت گیا۔ یونیورسٹی صبح کے وقت کسی طوائف کے اُجڑے چہرے سے بھی زیادہ بے رونق ہوا کرتی تھی۔ میں نے خزاں کی ساری ویرانیاں یونیورسٹی کے برآمدوں میں تنہا بیٹھ کر گزار دیں۔ صرف دس پندرہ دنوں کے لیے پنڈی جانا ہوا..... رات کے وقت میگزین کا کام کرتا اور صبح یہاں آ کر گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھا کرتا..... تو بے ہے الگ نہ ہوں تو یونیورسٹی قبر سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔

پرسوں شام جوں ہی تمھاری واپسی کی خبر پھیلی میں اور تنویر صابر اُسی وقت درشن لینے تمھارے ہاسٹل پہنچ گئے۔ دیکھ لو، ہم تو پھر یوں ہی نازل ہوا کرتے ہیں۔ ساتھ صبیحہ چکی پڑی تھی۔ اُس کے سامنے بھلا کیا خاک بات ہوتی؟ کینے میں چائے پیتے ہوئے میرا دل چاہ رہا تھا، اُسے اُٹھا کر نہر میں پھینک دوں..... تاکہ پوری آزادی سے تمھیں دیکھ تو سکوں۔

جانتی ہو پنڈی والے فنکشن میں تمھیں بلوانے کے لیے کتنا بھاگنا دوڑنا پڑا؟ یہ سارا معرکہ تنویر صابر نے سر کیا۔ جانے کیسے اور کہاں سے تمھارا ایڈریس نکال لایا۔ پھر نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ سوچا اگر ہم لوگ خط لکھیں تو تمھارے لیے کسی پریشانی کا باعث ہی نہ بن جائے۔ ہمارے بزرگ اپنی بیٹیاں تو مخلوط درس گاہوں میں بھیج دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ وہ لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہیں اور یہ جوان لوگ ایک دوسرے کے دوست بھی ہو سکتے ہیں۔ تنویر نے قلم ہائیں

ہاتھ میں لیا اور لڑکیوں جیسے انداز میں تمھیں خط لکھ مارا۔ یہ شیطان تو جیسے اس طرح کے خط لکھنے میں ماہر ہے۔ ہمارے بزرگ بھی روایات کے معے ہیں۔ سوچتے ہوں گے انھیں نے ہمارے راستے بند کر رکھے ہیں۔ انھیں کیا خبر جو ان لوگ بہتے پانی کی طرح اپنا راستہ آپ بنالیا کرتے ہیں۔ فنکشن والے دن، آخری لمحے تک تمھارا انتظار ہوتا رہا۔ ہر آہٹ پر دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں۔ تمھارا معذرت نامہ تو دوسرے روز ملا۔ پتہ چلا، پہلے ایبٹ آباد کی سیر ہوئی، وہاں دل نہ لگا تو مری کی فضا نہیں تمھارے وجود کی خوشبو سے مہکیں۔ کتنی خوش نصیب ہیں وہ بلندیاں جو تمھارے قدموں کی ڈھول بٹھہریں۔

ایک تو اس میگزین نے میری جان کھا رکھی ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر آج ایک بچے یونیورسٹی پہنچا تو کسی نے بتایا کہ تم اور شاہدہ میری تلاش میں دو دفعہ میرے ڈیپارٹمنٹ میں آئی تھیں۔ میں تم دونوں کو ڈھونڈتا پھرا..... اور کوئی دو بچے صرف شاہدہ سے ملاقات ہو سکی۔ اُس نے بتایا تم ذرا پریشان سی تھی۔ کسی پارٹی میں تم نے اپنے نام کے ساتھ میرا ذکر چلتے سنا۔ تمھاری کوئی سائرہ نامی سہیلی ہے اُس نے تمھیں یہاں تک بتایا ہے کہ وہ میری بھی دوست ہے اور میں نے خود اُسے یہ بات بتائی تھی۔

لو یہ بھی خوب رہی، ارے بھائی کسی نے انواہ چھوڑی ہوگی!..... پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔ سائرہ نام کی صرف ایک عورت سے میری جان پہچان ہے۔ وہ یہاں سے کوئی دو سو میل دور ایک اُجاڑ ویرانے میں بستی ہے۔ ہم سبھی گاؤں والے اُسے 'تائی سائراں' کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُس کی اپنی اولاد بھی اُسے 'تائی' کہہ کر بلاتی ہے..... میرا خیال ہے، یہ بوڑھی بنگالین بیوہ تمھاری پارٹی میں نہ آئی ہوگی۔ اگر کوئی جوان سائرہ ہے اور ہم سے دوستی کا دعویٰ بھی رکھتی ہے، تو پھر اُسے فوراً ہم سے ملوادو..... یوں مفت ہاتھ آئے تو نہ کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ انواہ صحرا میں برسی بارش کی طرح فوراً ہی اپنا اثر کھودیا کرتی ہے، اس لیے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب ہم میں کوئی تعلق نہیں، تو پھر پریشانی بے معنی ہے..... اصل میں ہمارے لوگ بڑے ہمدرد اور غم گسار واقع ہوئے ہیں۔ ہمیشہ دوسرے کے متعلق سوچتے ہیں اور بڑے ہی خلوص سے بُرائی دوسرے کے کھاتے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ یوں بھی

بہت مذہبی لوگ ہیں..... افواہ تو ایک کشف ہے، لہذا اسے مذہبی فریضہ جان کر ادا کرتے ہیں بے چارے! اگر تم زیادہ گھبرا گئی ہو، تو میں آڈیو ریم کی بلند چھت پر کھڑا ہو کر اس افواہ کے خلاف دو گھنٹے تقریر کرنے کو تیار ہوں۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ افواہ کسی چیز کے ہونے اور نہ ہونے کے درمیانی عرصے میں اُڑا کرتی ہے..... لوگ بس جاننے کی حد تک دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر اُن کے سامنے کچھ کر لیا جائے تو پھر افواہ نہیں اُڑاتے۔ کہو کیا خیال ہے؟

ویسے ایک بات ہے۔ کہیں تو تمہارے نام کے ساتھ اپنا ذکر بھی ہوا۔ جی چاہتا ہے افواہ اُڑانے والے کا منہ چوم لوں..... جانے کس نیک گھڑی اُس کے ذہن میں یہ خیال پھوٹا۔ واہ، واہ، لذت ہی آگئی۔

چلو چھوڑو یہ سب خرافات ہے۔ کوئی اور بات سناؤ..... کسی اچھی سی بات کے لیے کان ترس گئے ہیں..... اگر اجازت ہو تو ایک معمولی سی افواہ میں بھی اُڑالوں کہ میں نے تمہاری آنکھوں میں چاہت کے ہلکے ہلکے ڈورے دیکھے ہیں۔ کبھی آہستہ سے سر ہلا کر تصدیق کر دینا..... ہیں نا؟..... اس وقت رات کا ڈیڑھ بجنا چاہتا ہے۔ ہاسٹل کی فضا اپنی نسل کے بوجھل ذہنوں کی طرح..... وزنی سی دکھائی دے رہی ہے۔ کمروں کی روشنیاں بتدریج اندھیروں میں ڈوبتی جا رہی ہیں۔ سیاہ مستقبل کا خوف دل میں چھپائے، حال کی بے کیفی سے اُکتا کر اس دنیا کے باسی، اچھے اچھے خواب دیکھنے نیند کی آغوش میں جا پھنپے ہیں۔

تھوڑی دیر پہلے تک ساتھ والے کمرے میں نوجوانوں کا ہم غفیر موجود تھا۔ کچھ نادر تصویریں دیکھی جا رہی تھی۔ یار لوگ لیبارٹری سے مائیکروسکوپ اُڑالائے تھے کہ اس کے ذریعے نشیب و فراز کو اتنا وسیع کر سکیں..... کہ اُن کی تشنہ ذات ان نگلی تصویروں میں چھپ جائے۔ مائیکروسکوپ جس کے ہاتھ لگ جاتا اُس کی سانس پھول جاتی..... یوں نظر آتا جیسے وہ پکھل رہا ہو۔ اتنی دیر میں اُس سے کوئی دوسرا چھین لیتا۔ ایسی تصاویر بڑی پاپولر ہیں، اور بڑی محنت کے بعد ہی ہاتھ لگتی ہیں اس لیے نوجوان ان سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ پڑھے لکھے لوگ بھی کتنے بدیانت ہوتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں وہ کہہ نہیں پاتے، جو کہتے، وہ کرتے نہیں۔ اور جو کرتے ہیں، وہ صرف دھوکا

اور فریب ہوتا ہے۔ اُن کے پاس اپنے علم کے بہت سے چہرے ہیں جنہیں وہ موقع محل کی مناسبت سے پہنتے رہتے ہیں۔ اُن میں کفر کی ہمت ہے اور نہ مسلمانی کی، بے چارے فرشتے!
تم نے دیکھا نہیں یہ لوگ، اجداد کی عظمت رفتہ کے گیت گاتے تھکتے نہیں، کتنے زور سے چیخا کرتے ہیں۔ اخلاقی حسن کی تبلیغ کرتے ہیں۔ مگر اُن کی اصل صورت کتنی بھیانک ہے۔ عورتوں کی آزادی سے اُن کی مراد ہمیشہ دوسروں کی عورتوں کی آزادی ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اپنی ماں، بہن اور بیوی کو عورت نہیں سمجھتے۔ ان کے سارے بوگس نظریات کے پیچھے ان کی اپنی ذات کی خواہشات چھپی ہوتی ہیں۔ مردہ الفاظ کے قبرستان میں بسنے والے گورگن۔

میں تم سے اکثر یہ باتیں کہتا رہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اُن کی بنائی ہوئی روایات کو پسند نہیں کرتیں۔ تم میں..... ان سے لڑنے کی سکت موجود ہے۔ تم زندگی میں جہاں کہیں بھی رہو..... روایات کے کولہوکا نیل نہ بننا۔ میں نہیں جانتا پوری حقیقت کیا ہے؟ تاہم حقیقت کا آدھا حصہ میں نے پہچان لیا ہے..... اور وہ یہ کہ جو کچھ ہمارے ارد گرد ہو رہا ہے..... غلط ہے..... صحیح کیا ہے؟ اُس کا تعین ابھی مجھ سے نہیں ہو پایا۔ شاید یہ میرے دور کی مجبوری ہے کہ میں صرف آدمی سچائی جان سکا۔

میں سماجی زنجیروں کو توڑنا چاہتا ہوں، کیونکہ میں آزاد پیدا ہوا تھا۔ میں روایتوں کا دشمن ہوں، اس لیے کہ یہ روایتیں میں نے نہیں بنائیں۔ میں اخلاقی ضابطوں کو نہیں مانتا، اس لیے کہ یہ ضابطے میرے تخلیق کردہ نہیں۔ میں عقیدوں کے غباروں سے نہیں بہل سکتا اس لیے کہ میں ان کی حقیقت سے آشنا ہوں۔ میں خاندانی رئیسوں کی عزت نہیں کرتا، اس لیے کہ ان کے اجداد بادشاہوں کے خواجہ سرا تھے یا پھر انگریز کے کاسرہ لیس۔ یہ زمینیں انھیں خداری کے عوض ملیں۔ اس دولت پران کا کوئی حق نہیں۔ وہ دولت ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ نہ لائے تھے۔ یہ ہم غریبوں کا خون ہے۔

فطرت نے ہر انسان کو ذہن اور جسم دیا۔ سورج سب کے لیے روشنی کا پیامبر ہے۔ ہوا سب کے لیے زندگی کی ضامن ہے۔ جب بارش برسی ہے، تو امیر کا محل بھی بھگ جاتا ہے اور غریب کا جھونپڑا بھی۔ انسان کی پیدائش کا عمل ایک ہے۔ اُس کی موت کا عمل ایک ہے۔ بھوک سب کو لگتی ہے،

تفنگی سب کو محسوس ہوتی ہے۔ دکھ کا احساس سب کے لیے تکلیف دہ ہے۔ خوشی کی کیفیت سب کے لیے یکساں ہے۔ فطرت کی نعمتیں سب کے لیے عطیہ ہیں۔ جب فطرت کا سلوک مادر مہربان کی مانند مسادی ہے۔ جب فطرت کے نزدیک سب انسان برابر ہیں..... تو محض حادثہ پیدائش کی بنیادوں پر کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا وہ بچے نہیں ہوتے، جنہیں مائیں چٹائی پر جنم دیتی ہیں؟ کیا وہ انسان نہیں ہوتے جو غریبوں کے گھر میں جنم لیتے ہیں؟ اگر کوئی ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پیدا ہوتا ہے، تو اس حادثے میں اُس کا اپنا کیا کمال؟ وہ جھونپڑے میں بھی اُگ سکتا تھا۔ یہ تفریق چند انسانوں کی پیدا کردہ ہے۔ امارات اور غربت خدا نے نہیں بنائی۔ خدا اتنا بے انصاف نہیں ہو سکتا۔ یہ تفریق سماج نے پیدا کی ہے۔ یہ غیر فطری، غیر انسانی اور غیر اخلاقی تفریق ہے۔ اسے ختم کرنا ہوگا۔ اسے مٹانا ہوگا۔ تاکہ نسل آدم اس کرۂ ارض پر سکون سے سانس لے سکے۔ فطرت کے رازوں کو سمجھ سکے۔ کائنات کی قوتوں پر قبضہ پاسکے۔ یہی مقصدِ حیات ہے۔

زندگی صرف بچے پیدا کرنے کا نام نہیں بلکہ ان بچوں کو بہتر انسانی ماحول دینے کا بھی نام ہے۔ تمھاری شادی بھی ہوگی۔ بچے بھی پیدا ہوں گے..... پھر بڑھاپا..... اور آخر چل چلاؤ..... زندگی کتنی مختصر ہے! اس سانس برابر زندگی کو کار، بنگلے اور دولت کے بوجھ تلے دبا کر ختم کر دینا، یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ بچے تو بھینسیں بھی پیدا کر لیتی ہیں.....

تم عورت ہو، کسی دن میری بات پر غور کرنا۔

اچھی تمناؤں کے ساتھ
تمھارا دوست

۱۷/۱۰/۱۹۷۷ء

۱۲۹- سرسید ہال

دیوی جی

شاہدہ مسکراتی، ہلکھلاتی کوئی دو بجے کے قریب کیفے ٹیریا پہنچی۔ میں لان میں اُسی درخت کے نیچے تنہا بیٹھا، تمھارے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ اُس نے دور سے نعرہ حیدری بلند کیا۔ کہنے لگی ”ساری یونیورسٹی چھان ماری ہے، اور آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔“ میں نے کہا، ”جانتی ہو، بدھ نے ایک ایسے ہی درخت تلے نروان کا گیان پایا تھا۔ میری بے چین آتما بھی شانتی کی تلاش میں ہے۔“ اُس نے مسکراتی آنکھیں نہچاتے ہوئے کہا ”گیانی مہاراج، اب تپسیا بند کیجئے، میں آپ کے لیے نروان کا سندیسہ لائی ہوں۔“

لیکن تمھاری اس داسی نے مجھے جی بھر کر ستایا۔ کہنے لگی ”خوشی کا پیغام ہے۔ پہلے منہ میٹھا کراؤ۔“ جب منہ میٹھا ہو چکا تو اُس نے عجیب سامنے بنا کر کیفے والوں کو بددعائیں دیں کہ ہر باسی شے یہاں فروخت کرتے ہیں۔ سارا ذائقہ ستیاناس ہو کر رہ گیا۔ فوراً جوس پلاؤ۔ جوس سے فارغ ہو کر اُس نے اپنی آنکھیں ماتھے پر دھکیلتے ہوئے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا، اور سکون سے بیٹھ گئی۔ چار پانچ منٹ گزرے تو میں نے تنگ آ کر کہا، ”اب کچھ پھوٹو بھی۔“ بس پھر کیا تھا، اُس نے میز پر مکے برسانے شروع کر دیئے۔ ”بیڑہ غرق کر دیا۔ آدھا پیغام اس دخل در معقولات کے باعث ذہن سے فرار ہو گیا ہے۔ دو منٹ صبر نہیں ہو سکا۔ توبہ ہے اتنی بھی بے قراری کیا؟“

میں نے کہا ”تم یہیں بیٹھ کر مفروضہ کو تلاش کرو میں ہاسٹل چلتا ہوں۔ جب سب کچھ یاد آ جائے تو وہیں آ کر بتا دینا۔“ اُس نے جھپٹ کر میری کتابیں چھین لیں ”ادھر بیٹھئے۔ مجھے کیا آپ دونوں نے اپنا نوکر سمجھ رکھا ہے؟“ صاحب کی تلاش میں میرا ایک پیریڈ پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے۔ رات بھر بیگم صاحبہ مجھ غریب کو جگائے رکھتی ہیں۔ ہر وقت ’صاحب‘ کی تعریفیں، مجھے

پڑھنے دیتی ہیں نہ خود پڑھتی ہیں۔ میں کہتی ہوں، مجھے فیل کرانا چاہتے ہیں آپ لوگ۔“
میں نے اُس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”بی بی مناسب وقت پر خدا تیری گود ہزار بار ہری کرے، اپنا بیان جاری رکھ۔“

شاہدہ نے بتایا، تم پرسوں کے دن کیسپس سے باہر مجھ سے ملنا چاہتی ہو۔ لیکن ہوٹل کی بجائے کوئی پرائیویٹ جگہ ہو، جہاں سکون سے بیٹھ کر بات چیت کر سکیں۔ اُس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں کہ اُس نے مجھ سے کیا کچھ کہا؟ شاید کہہ رہی تھی میں کل شام تک پروگرام بنا کر تمہیں اطلاع دوں اور اپنے متعلق بھی کچھ بتا رہی تھی۔ شاید اشرف کے ساتھ جائے گی، یا ہمارے ساتھ چلے گی۔ خیر تم اُس سے پوچھ لینا۔

اگر میرے مقدور میں ہوتا، تو تمہارے نامہ بر کے ہر لفظ پر میں اُسے آبِ حیات کا پیالہ پیش کرتا جاتا۔ اگر ممکن ہوتا تو اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اُس کے قدموں پر ڈھیر کر دیتا..... اگر ہوش میں رہتا تو اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر ہاشل تک پہنچا آتا۔ شاہدہ میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی لے کر آئی لیکن میں مفلس اُسے دعاؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا.....

باہر جانے کے لیے دو جگہیں میسر ہیں۔ ایک تو شہر میں میرے کزن والا فلیٹ خالی ہے اور دوسرے ٹھوکر نیاز بیگ میں ”لیزا سینما“۔ اُس جانب کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔ سینما کے مالک شاہ جی اپنے یار ہیں۔ اپنا کمرہ خاص عطا کریں گے۔ فلم بھی دیکھتے رہیں گے اور ساتھ ساتھ گپ شپ بھی چلے گی۔

یوں کر نا، تم ایک بجے وحدت روڈ والے موٹر پر پہنچ جانا۔ میں رکشے لے کر آؤں گا۔ پھر وہاں سے جدھر بھی جانا ہوا چلے جائیں گے۔ میری جان! میں پیدل چلا کرتا ہوں۔ اور حد ہو تو رکشہ پر۔ میرے ساتھ چلو گی تو تمہیں بھی یہی ٹھوکریں کھانا ہوں گی۔ چلنے سے پہلے ایک بار پھر سوچ لینا.....
رات کے تین بج چکے ہیں، لیکن نیند ہے کہ آنے سے گریز پا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پرسوں کا سورج کہیں تین صدیوں بعد طلوع ہوگا۔ خدا جانے ان تین صدیوں میں کیا کچھ ہو جائے؟ کوئی زلزلہ آجائے، کوئی حادثہ پیش آجائے، کوئی سیارہ زمین سے آن کرے۔ کوئی بیماری، ناچاری آن دبوچے۔ مجھے ہر وہم سے خوف آرہا ہے۔ ہر اُس خیال سے جو مجھے پرسوں کے دن

سے محروم کر سکتا ہو۔ ہاں جب پرسوں آئے گی، تم میرے قریب ہوگی، میرے ہونٹ تمہارے لبوں پر پیوست ہوں گے، اُس لمحے قیامت بھی آجائے تو کم ہے۔ پھر یہ کائنات رہے نہ رہے۔ مجھے اِس کی پرواہ نہ ہوگی۔ لیکن پرسوں تک مجھے یہ کائنات اِسی حالت میں چاہیے..... صرف پرسوں تک!

تمہارا پجاری

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

۱۹/ اکتوبر ۱۹۷۷ء

۱۲۹۔ سرسید ہال

جان جی

باہر کی دنیا مستیوں کی انتہا پر ہے۔ قہقہے برساتے بادلوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو پھوٹ رہے ہیں۔ یوں لگ رہا ہے، جیسے میرے وجود سے اُلتے نغموں نے ساری فضا پر اجنبی سا سحر بکھیر دیا ہو۔ کائنات میرے خوشی سے دھڑکتے دل کے ساز پر کھلکھلاتی ہوئی رقصاں ہے۔ دیواریں جھوم اُٹھی ہیں۔ زمین میرے ارد گرد گھومتا شروع ہو گئی ہے، سورج نے غروب ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ سمندر اپنا سکون کھو چکے ہیں اور خدا زمین پر آ بیٹھا ہے، ساری دنیا رشتک بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ جیسے معنی خیز انداز میں کچھ پوچھ رہی ہو..... بہت خوش ہوں اتنا کہ اپنے آپ کو سنبھالنا بھی دو بھر ہوا جاتا ہے۔ خوشیاں دینے والے نے کب سوچا ہوگا کہ ہم ایسے لوگوں سے اتنا کچھ برداشت ہو بھی پائے گا یا نہیں؟

یاد رکھئے آج اکتوبر کی 19 تاریخ ہے۔ کوئی بڑا ہی شہ دن۔ آپ نے پہلی بار مجھے سینے سے لگایا ہے۔ جہی ہر جانب شادیاں بچ رہے ہیں۔ میں نے تو جاگتے میں ایک خواب دیکھا تھا۔ دھندلا سا خواب۔ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس کی تعبیر اتنی خوب صورت ہوگی۔ لوگ تو دیوانے ہیں، افسانے لکھتے ہیں..... جھوٹ کے بد صورت پلندے۔ میرے پاس آئیں تو انھیں بتاؤں کہ حقیقت اُن کے سارے قصوں سے زیادہ حسین ہے۔ کوئی نئے الفاظ لائیں اور نئے معنی ورنہ اُن کی گھسی پٹی روایتوں میں حقیقت کا بوجھ سہارنے کی سکت نہیں.....

میں لوگوں سے ذرا مختلف ہوں۔ لوگ خدا کو مانتے ہیں، میں اُسے ڈھونڈتا ہوں۔ بہت پہلے بچپن میں میرا خیال تھا، وہ میرے باپ ایسی شکل کا آدمی ہوگا۔ اُس کی طرح سخت اور غلط کام پر سزا دینے والا۔ اُس کی مونچھیں ہوں گی، اور کبھی کبھار نائی سے ڈاڑھی بھی بنواتا ہوگا۔ دُور

آسمانوں میں کرسی پر بیٹھا اس بات کا منتظر ہے کہ کب میں مروں اور وہ مجھے سزا دے۔ زمانہ ذرا آگے بڑھا تو ذہن میں کئی زلزلے آئے۔ ایک دنیا اُجڑی ایک آباد ہوئی۔ میں نے تنگ و افلاس اور ذلتوں کے ہمالہ تلے دبے انسان کو دکھوں کے آلاؤ میں دیکھتے دیکھتے کھیتوں کی سوندھی سوندھی خوشبو میں چلتی پھرتی انسانی لاشوں کے مناظر میرے احوال کا اثاثہ تھے۔ جھکی کمریں، کھر درے ہاتھ، ارد گرد پھیلی ناکامیاں۔ اُس وقت میں نے پہلی بار سوچا، خدا میرے باپ کی طرح بے بس اور اتنا نادار نہیں ہو سکتا اس کی شکل کسی اور سے ملتی ہوگی.....

..... پھر میں اپنے گاؤں کے سکول پہنچا جو آج بھی عمارت ایسی کسی شے سے بے نیاز ہے۔ برکد کے بوڑھے درخت تلے گھر سے لائی ہوئی بور یوں پر ہم بیٹھے۔ بے چارہ اُستاد کرسی کی بجائے ایک پرانے تنے پر اپنے تخت جمانا۔ اسی درخت کی کسی شاخ سے 'مولابخش' بنانا، جس سے ہم لوگوں کی ٹھکانی، ہوا کرتی۔ بوڑھا اُستاد کہا کرتا تھا۔ چار کتابیں عرش سے اُتری ہیں اور پانچویں یہ 'مولابخش'، ہمیں اُس وقت چار کتابوں کا پتہ تھا، نہ کوئی غرض، ہمارے سامنے تو صرف پانچویں شے یعنی 'مولابخش' ہی تلخ حقیقت تھا۔ مگر بوڑھے اُستاد کی 'چار کتابوں' اور 'مولابخش' کے عمل سے گزرنے والے شاگردوں میں سے کوئی پانچویں جماعت سے آگے نہ جایا کرتا تھا۔ اُسی زمانے میں میرے بڑے بھائی کراچی سے ولایت چلے گئے۔ یوں ہمارے حالات نے ذرا سی انگڑائی لی۔ ایک عرصہ بعد جب میں کالج پہنچا تو صدیوں سے آباد اپنے گاؤں کا پہلا فرد تھا، جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر پہنچا تھا۔ شہر کی دنیا نئی دنیا تھی۔ ایک جانب موٹریں، کاریں اور کٹھیاں تھیں اور دوسری جانب بکتے جسم، زرد چہرے اور قبروں سے جھانکتی آنکھیں..... اُس زمانے میں مجھے یقین ہو گیا کہ خلا کے اندھیروں میں کوئی اُجالا نہیں..... ورنہ یہ سب کچھ کیوں ہوتا؟ زندگی میں پہلی بار جب میں نے آسمان کی کوکھ سے برف کو جنم لیتے دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود میں سے کوئی اجنبی شے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ یہ فطرت کا لازوال حسن تھا..... یہ لمحہ اتنا گہرا تھا کہ میرا جی خدا پر ایمان لانے کو چاہا۔ میں نے سوچا، شاید خدا حسن کا نام ہے۔ یہ ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے۔ جب ہم کالج کے ایک ٹرپ پر کاغان گئے ہوئے تھے۔ دوسری بار..... میں نے کوہ طور کو اپنے اندر اُترتے محسوس کیا۔ توپل بھریوں لگا جیسے کوئی اجنبی قوت میرے جسم کے

سارے بند تو ذکر میری رُوح کے اندر گھسنا چاہتی ہے۔ اُس وقت تم نیم وا آنکھوں کے ساتھ میرے سینے سے چمٹی تھی۔ تمھاری اُکھڑی اُکھڑی گرم ریشمی سانس میرے حلق سے نیچے اتر رہی تھی۔ میرے جلتے ہونٹوں پر تمھارے رسیلے ہونٹ پیوست تھے۔ میں الفاظ کی دنیا سے بہت دُور، بہت پرے پہنچ چکا تھا۔ جہاں زمین کی گردش سے بکھرتا ترنم..... خاموش آوازیں..... بے آواز موسیقی..... چپ کے ساز..... اُن گائے گیت اور الفاظ کے بغیر نغمے تھے۔ میں نے سورج کو بار بار اپنے خون میں ڈوبتے محسوس کیا۔ اس تپش سے میں جل اٹھا، مگر یہ آگ اتنی لذیذ تھی..... کچھ مت پوچھئے۔

اُس لمحے میں نے خود کو مکمل پایا..... اور سوچا میں بھی کتنا دیوانہ ہوں۔ صدیوں سے جس حقیقت کو آسمانوں میں ڈھونڈتا پھرا..... وہ تو خود میرے اندر موجزن تھی۔

آج میں نے تم سے کہا تھا کہ تمھیں اپنے متعلق تفصیل سے بتاؤں گا۔ روایتاً مجھے صرف اتنا سا جھوٹ بول دینا چاہیے تھا کہ تم سے پہلے مجھے کوئی عورت اچھی ہی نہ لگی..... اور میں ایک 'فرشتہ' ہوں میرا خیال ہے میں خود کو انسان سمجھتا ہوں..... فرشتوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

تو سنو..... پہلی لڑکی میری زندگی میں اُس وقت داخل ہوئی جب مجھے اپنے مرد ہونے کا احساس نہ تھا۔ میں اور وہ کھیتوں میں الہڑ پھڑوں کی طرح بھاگا کرتے۔ مستقبل سے بے خبر، کسن نادان، محبت اور نفرت دونوں سے ناواقف..... اُس کا نام ارشاد تھا۔ لڑکی کا یہ مردانہ سانا نام سن کر تمھیں ہنسی تو آئی ہوگی۔ پر گاؤں کے لوگ ناموں میں اتنی گڑبڑ ضرور کر جایا کرتے ہیں۔ نام رکھنے والی بوڑھیاں، ایسا نام رکھنے کی کوشش کرتی ہیں جس کو وہ خود آسانی سے ادا کر سکیں..... اور بس، لمبے فساد کو کون جانتا ہے۔

ارشاد مجھ سے بڑی تھی..... اور یوں بھی لڑکیاں سادانی کی فصل کی طرح بہت جلد بڑھ جاتی ہیں۔ اُس وقت میں قریبی قصبے کے سکول میں غالباً ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ گاؤں میں پہلے تو کوئی پڑھتا ہی نہیں اور جو سکول تک پہنچ گیا وہ شہر میں پڑھنے والوں سے مختلف ہوتا۔ سکول سے گھر پہنچتے تو مشقت کے کولہو میں جتے ماں باپ کے ساتھ مل کر کام میں لگ گئے۔ ایک دن سکول سے واپسی کے بعد معمول کے مطابق مجھے چارہ کاٹنے جانا تھا۔ برسات کا موسم، شدید جس اور گھٹن

کا عالم، پورا گاؤں باجرے اور مکئی میں ڈوبا تھا۔ میں درانتی لیے گاؤں سے کوئی دو فرلانگ دُور اپنے قد سے تین گنا اُوچی مکئی میں گم، تازہ گھاس ٹکالنے میں مصروف تھا۔ اس موسم میں کھیت میں گھسنا بڑا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مارے گرمی کے انگ انگ سے پسینہ اُبل اُٹھتا ہے۔ فصل کے کنوارے پتے جسم کے جس حصے پر لگیں، کھال اُتر اُتر جاتی ہے۔ ایسی تیز خارش بھڑکتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھے۔

دنیا سے بے خبر تیزی سے اپنے کام میں جتا تھا۔ اتنے میں ساتھ والے کھیت سے مانوس آواز آئی ”ماسی ذرا گھاس اُٹھوا جانا“۔ یہ ارشاد تھی۔ میں نے درانتی روکی اور زور سے کہا ”ماسی نہیں آئی۔ اس کا پتر ہے اور گھاس بالکل نہیں اُٹھوئے گا۔“ ارشاد جانتی تھی، میں ہر کام سے پہلے ”نہ“ ضرور کیا کرتا ہوں۔ اُس نے دوبارہ آواز دی ”آ جا مجھے جلدی گھر جانا ہے، میرا بابو.....“ گاؤں کی لڑکیوں کے لیے ”بابو“ کسی تصوراتی شہزادے سے کم نہیں ہوتا جیسے آپ کے یہاں لڑکیاں ہی ایسی پی افروں کے خواب دیکھتے دیکھتے بوڑھی ہو جاتی ہیں پر باز نہیں آتیں۔

میں نے دوبارہ کہا ”میں تیرا نوکر نہیں، اتنا کاتتی جو خود اُٹھا بھی لیتی۔“ پودوں میں سرسراہٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری طرف آ رہی ہے۔ یقین کیجئے میں اُس لڑکی سے خاصا ڈرا کرتا تھا۔ بچپن میں کئی دفعہ اُس نے میرے کان جڑوں سے ہلائے تھے۔ اور مجھے ”نہ“ سے باقاعدہ توبہ کروائی تھی۔ اب تو وہ اچھے خاصے تیل پلائے بھینے کی طرح تھی۔ دو گھڑے سر پر اور تیسرا بغل میں دبائے بھاگی پھرتی۔ گاؤں میں جب لڑکی تین گھڑے اُٹھائے یا اپنی پنڈلیوں کے زور سے ”پینگ“ کودبا کر اُونچا ”ہلارہ“ دینے کی کوشش کرے تو سمجھ لیجئے مفلس کی بیٹی جو ان ہوگئی..... بڑے لوگوں کی بیٹیاں جب جوان ہوتی ہیں تو ”بے چاریوں“ کی نازک کر اس بوجھ سے ہی جھک جاتی ہے۔ نظر کی عینکیں ناک پر، بغل میں کتابوں کا بنڈل اور ذہن میں نئے ماڈل کی کاریں ہارن بجاتی پھرتی ہیں۔

ارشاد نے آتے ہی کہا ”ٹھہر تجھے سیدھا کرتی ہوں۔ سکول کیا جاتا ہے خود کو بابو ہی سمجھ بیٹھا ہے۔“ اُس نے میرا بازو پکڑ کر اُلٹا گھمایا، اور گھسیٹتی ہوئی اپنی کھیت کی جانب لے گئی۔ میں بچہ تو نہ تھا، جویوں مار کھا لیتا۔ بُرا لگا اور غصہ بھی آیا کہ وہ کیوں مجھے جانوروں کی طرح ہانک کر کام لینا

چاہتی ہے۔ میں نے احتجاجاً اُسے گالی دے دی۔ بغیر کچھ بولے وہ پلٹی اور تزاخ سے مجھے ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ ایک دفعہ میرے ذہن میں آیا کہ درانتی اُس کے پیٹ میں گھسا دوں۔ لیکن اُسے مارنے کی بجائے میں نے درانتی پر بھینک دی اور پورے زور سے رو دیا۔ شاید اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ مجھے مارا کرتی تھی۔ پھر جانے کیوں چپ بھی کرایا کرتی تھی۔ یہ کھیل بچپن سے جاری تھا۔ مگر آج اُس نے چپ نہ کرایا بلکہ خود رو اٹھی تھی۔ میں حیران ہو کر خاموش ہو گیا کہ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس نے مجھے اپنے قریب کیا اور پھر پوری شدت سے مجھے اپنی چھاتی سے چمٹالیا۔ پسینے کے باعث اُس کی قمیض بدن سے چپکی پڑی تھی۔ میں نے خود کو اُس کے گیلے بدن کے ساتھ چپکتا محسوس کیا۔ اُس دن پہلی دفعہ مجھے اپنے مرد ہونے کا احساس ہوا۔

میں میٹرک میں تھا تو اُس کی شادی ہوئی۔ میں نے سکول جانا چھوڑ دیا اور چارپائی پر لیٹے لیٹے مریض بن گیا۔ ایسے روگ لگا گئی کہ میری صحت پھر کبھی اچھی نہ ہو سکی۔ مجھے کہا کرتی تھی ”چل یہاں سے بھاگ چلیں۔“ میں مگر بھاگ نہ سکا۔ جانتی ہو کیوں؟ اُس کی ماں جوانی میں میرے چچا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اُس کے باپ نے میرے چچا کو قتل کر دیا۔ تب سے ہمارے خاندانوں کے درمیان نفرت کا ایک دریا بہہ رہا تھا میں اسے وسیع کر سکا نہ اسے پاٹ ہی پایا۔ میری ماں نے کہا تھا ”تو کن راہوں پر چل نکلا ہے، مجھ میں تیری لاش پر رونے کی ہمت نہیں“.....

اور میں لوٹ آیا مگر میرے چار سال گرد بن کر کتابوں میں جمع ہو گئے۔

چار سال بعد، ایک دن وہ مجھے ملی، اور کہنے لگی ”قسمت میں یہی لکھا تھا، اب مان بھی لو شہر جا کر بہت سارا پڑھو، کسی میم سے شادی کرنا، میں تمہارا سہرا خود باندھوں گی۔“ میں نے کتابوں کی گرد جھاڑی اور ایک عرصے بعد دوبارہ سکول کی چار دیواری میں داخل ہوا۔

تم حیران تو ہو گی مگر یہ حقیقت ہے کہ میرے اور ارشاد کے تعلقات انتہائی سادہ تھے۔ وہ رات کے اندھیروں میں دبے دبے، میرے پاس پہنچ جایا کرتی۔ میں سونے کے معاملے میں سخت واقع ہوا ہوں ایک بار آنکھ لگ گئی تو یوں جانوں لگ ہی گئی..... بے شک تو میں دغتی رہیں، پھر اپنی آنکھ کبھی نہ کھلی۔ ارشاد میرے ساتھ لیٹ کر میرے سر میں اٹکلیاں پھیرنا شروع کر دیتی اور یوں

اکثر مجھے جگائے بغیر رات بھر میرے پاس رہتی۔ دوسرے دن اُس کا رومال مجھے اپنے بستر پر ملتا۔ یہ اُس کے آنے کی نشانی ہوتی تھی۔ میں اُس سے لڑتا ”بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے، جگایا کیوں نہیں تھا؟“ وہ آہستہ سے کہتی ”میں نے سوچا تم تھکے ہوئے ہو گے پڑھتے ہونا۔“

اُس کے جسم سے مجھے ایک خاص قسم کی خوشبو آتی تھی۔ جسم کی خالصتاً اپنی خوشبو۔ میں اُس سے پوچھتا ”یہ عجیب سی خوشبو کیوں آتی ہے؟“ وہ کہتی ”تمہیں آتی ہوگی۔ مجھے تو بالکل نہیں آتی۔“ اُس زمانے میں میرا خیال تھا کہ یہ خوشبو کچھ کچھ حلوے کی طرح میٹھی سی ہے۔ ایک عرصے بعد پتہ چلا کہ اس خوشبو کا اصل منبع اُس کے سینے سے شرابور نفل تھے۔

پھر زمانے نے آگے کی جانب جست بھری۔ اب میں کالج میں تھا۔ کالج کی دنیا نے زمانے کی عکاس تھی۔ یہاں عورتیں مرد اکٹھے پڑھتے تھے۔ گورڈن کالج ملک کا بہترین تعلیمی ادارہ میرے آبائی ماحول سے بہت مختلف تھا۔ یہاں لوگ ارشاد کی طرح پیار کرنے کی بجائے ”فلرٹ“ کیا کرتے تھے۔ میرے لیے یہ نئی بات تھی کہ لوگ بیک وقت چار چار جگہ اوپر نیچے چکر چلانے میں فخر محسوس کرتے۔ میں اجدد یہائی پہلے تو خوف زدہ بھیڑ کی طرح دُور کھڑا رہا۔ بالآخر میں نے بھی دوسری بھیڑوں کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ یہ بھی عجیب لوگ تھے، کچھڑ میں نہرا ہے تھے اور سمجھتے تھے اس طرح اُن کے جسم دھل جائیں گے۔ میں گنوار، کچھڑ میں اترتے لمحے یہ جانتا تھا کہ کچھڑ میں نہانے سے گندگی کیسے دُور ہو سکتی ہے؟ لہذا کوئی خواہش کئے بغیر، ہجوم کے درمیان تھا، ضرورت کا رشتہ تھا، چلتا رہا۔

ایسی دوران ایک لڑکی میرے قریب جانے کیوں آگئی، حالانکہ میں اُس کی سہیلی کو پسند کرتا تھا۔ اُس کا نام عتیقہ تھا۔ سائنو لی سی مگر خاصی اچھی تھی۔ میں نے اُسے منع کرایا پروہ نہ مانی۔ میں نے پیار سے سنبھال کر اُسے اُس کے خاوند کے حوالے کر دیا۔ شادی کے ایک ماہ بعد غریب اپنے بنگالی خاوند سمیت یحییٰ خان کی لشکر کشی کا نوالہ بن گئی۔ اُس نے اپنی شادی پر ایک ریکارڈ مجھے بھیجا تھا۔

”تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے“

ریکارڈ آج بھی میرے پاس پڑا ہوا ہے، مگر وہ بے چاری خود جانے کہاں کھو گئی! مجھے اُس سے پیار تھا نہ نفرت، صرف ہمدردی کہ وہ کچھڑ میں نہائے بغیر مر گئی۔ ایک تو بنگال تھی دوسرے گناہ گار نہ

تھی۔ شاید خدا بھی اُسے معاف نہ کرے!

کالج کے آخری سال میں ایک شوخ و شنگ سی لڑکی میرے خاصی قریب آ گئی۔ کچھڑ میں تیرنے کی ماہر تھی۔ اُس کے سفید چہرے پر کچھڑ کی کئی تہیں لگی تھیں۔ اُس نے ابتدائی ٹریننگ ایک شادی شدہ ملٹری آفیسر سے حاصل کی اور پھر اس میدان میں یکتا ہو گئی۔ اُن دنوں ایک مشہور سٹوڈیو اونر کے بھتیجے کے ساتھ مصروف تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پیپلز پارٹی میدانِ جنگ میں تھی اور میں اپنے کالج میں بھٹو صاحب کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔ یہ لڑکی اکثر سوشلزم کے خلاف بحث کرنے چلی آتی۔ پھر جانے کیوں اُس نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ شاید اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو میں ضرور پنجاب کا گورنر لگ جاؤں گا۔ (کھر صاحب کے متعلق بے چاری کی معلومات صفر تھیں) میرے معاملے میں دھوکا کھا رہی تھی، کل کتنا اندھیرا ہوگا۔ میں اُسے اکثر بتاتا۔ وہ سمجھتی شاید میں خاکساری سے کام لے رہا ہوں..... آخر اُس نے مجھے دیوبچ ہی لیا!

وہ میرے ’بہترین مستقبل‘ کا انتظار کر رہی تھی..... یا پھر حسبِ عادت فلرٹ کرنے میں مصروف تھی۔ تاہم اُس نے جلدی محسوس کر لیا کہ وہ غلط جگہ پر آ گئی ہے۔ اُس پر دُورے پڑنے شروع ہو گئے۔ پنڈولم کی طرح کبھی ایک کونے پر کبھی دوسرے پر۔ ایک دفعہ اُس نے مجھے مری بلایا۔ جوں ہی ہم باہر نکلے، ہمیں بارش نے آن لیا۔ ہم ایک درخت کے نیچے چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں اُس نے مجھ سے چٹ کر کہا تھا۔ ”مجھے کہیں لے چلو، ہمیشہ کے لیے میں اپنی ماں سے بہت تنگ ہوں۔“ اُس کی آنکھوں سے بھی برسات اُمڈ آئی۔ میں اُس کی بات کا مطلب سمجھتا تھا کہ مجھے کار پر بٹھا کر کسی شاندار سی کوٹھی میں لے چلو۔ اُسے کہاں لے جاتا؟ میرے پاس اپنی غربت کے سوا کوئی شے نہ تھی اور غربت اُسے پسند نہ تھی۔ یوں تو وہ بھی اپنی ہی طرح کی ایک فیملی سے آئی تھی مگر اُس کی آنکھوں میں سکے ٹھکنے لیا کرتے تھے۔

ایک بار ہم فلم پر گئے۔ فلم میں ہیروئن کی زبردستی شادی ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے لپٹ کر جھم جھم رونے لگی یعنی وہ مجھ سے پیار تو بہت کرتی ہے..... پر یہ ظالم سماج اُس کی آرزوؤں کا قاتل بن جائے گا..... وہ کتنی مجبور ہے! میں فلمی ہیرو تو نہ تھا جو ”وٹن“ کو فوراً قتل کر دیتا۔ بڑی ہی

اکساری سے میں نے اُس کے کان میں کہا ”محترمہ جب آپ کی شادی ہوگی تو یقین کیجئے آپ کو اس لمحے آج کا یہ رونادھونا یاد تک نہ ہوگا۔“ اُس نے غصے میں آکر رونا بند کر دیا اور ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

مجھے اُس کی باتیں یاد آتی ہیں، تو اکثر ہنسی آ جاتی ہے۔ جب وہ مجھے اپنے ”عشق“ کا رورور کر یقین دلایا کرتی تھی۔ میں نے کبھی اُس کے ماضی کا ذکر نہیں چھیڑا۔ مگر وہ ہر وقت اپنی ”پاک بازی“ کی قسمیں کھاتے نہ تھکتی تھی۔ اس پر مجھے گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کی وہ کہاوٹ یاد آ رہی ہے ”بالوں والی عورت اور بغیر بالوں کے مرد دونوں ہی بے وفا ہوتے ہیں۔“ بالوں کے لحاظ سے تو ہم دونوں ہی خاصے بے وفا تھے!

اُسے چاند کے حسن سے بڑا پیار تھا۔ ایک شام بہت ہی رومانی موڈ میں کہنے لگی۔
 ”چاند کو دیکھ کر تمہیں کچھ ہوتا ہے؟“ میں نے کہا ”ہاں ہوتا ہے، لوگوں کے دلوں کی طرح بد صورت ہے۔ سورج کی دی ہوئی روشنی سے چمکتا ہے۔ مگر چکر زمین کے ارد گرد لگاتا ہے۔ ہمارے بہت سے دوستوں کی طرح اس کی ٹانگیں ہیں، نہ سر۔ کتنا مجبور ہے۔ زمین بن سکتا ہے اور نہ سورج، دونوں کو فلرٹ کرتا ہے..... بے چارہ“ وہ اُمان گئی کہ میں اُس پر طنز کر رہا ہوں حالانکہ میں تو چاند کے متعلق بات کر رہا تھا۔

پھر..... ایک دن اُس نے ایک نئی ڈائری میں اُنکھیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ مجھے اُس کا بدلتا چہرہ دیکھ کر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ غریب اپنے باہر کوڑھانچے تھک چلی تھی مگر جب اندر باہر نکل آئے تو بھلا کیسے چھپے۔ جتنی بار وہ باہر کوڑھانچے تھی اندر اتنا ہی اوپر زیادہ رنگا ہو جاتا تھا۔ وہ عریانی کو ننگے لباس میں جکڑنے کی سعی ناکام کر رہی تھی۔ لیکن میری دعا ہے، اُسے اُس جہاں میں جنت ملے اور اس جہاں میں کار، دونوں ہی کی اُسے بہت آرزو تھی..... جانتی ہو یہ لڑکی کون تھی؟ تمہاری سہیلی ناز.....

میرا خیال ہے انسان کی عصمت جسم کے کسی خاص کونے میں نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق انسان کی پوری ذات سے ہے۔ مجھ سے بہت سی غلطیاں بھی ہوئی ہیں، مگر میں نے اپنی لحاتی خوشیوں کی جستجو میں کسی کو کبھی اپنی بھوک کی آگ کا ایندھن نہیں بنایا۔ میں نے گناہ و ثواب دونوں

ہی خلوص سے کیے ہیں۔ مگر گناہ کی معافی چاہتا ہوں نہ ثواب کا اجر مانگتا ہوں۔ میں نے پورے صدق دل سے اپنا ماضی تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے..... تاکہ کل تمہیں کوئی پریشانی ہو اور نہ مجھے شرمندگی۔

تم کہتی ہو تو یوں ہی سہی ٹھیک ہے، سوائے شاہدہ ملک کے کسی کو بھی نہ بتایا جائے۔ وہ تو تمہارا سایہ ہے۔ اُس سے ڈکھ دینے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ویسے بھی تمہیں میری جانب مائل کرنے کے لیے اُس نے بہت کوشش کی ہے۔ میرا ذاتی طور پر خیال تھا کہ کسی سے بھی کچھ نہ چھپایا جائے۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چند لمحے گزارنا ہی چاہتے ہیں تو لوگوں سے ڈر ڈر کر کیوں گزاریں۔ اگر دس بارہ دفعہ پیدا ہونا ہو تو پھر ایک دفعہ ڈر کر زندگی گزار لی جائے اور دوسری بار دل کی رہی حسرتیں پوری کر لی جائیں۔ صرف ایک ہی زندگی اور وہ بھی اتنے خوف تلے، کم از کم میرے لیے یہ پابندی ناقابل برداشت ہے۔

ٹھیک ہے ہم بہت دیر بعد ملے۔ اب کوئی اچھی سی توقع پیدا کر لینا حماقت ہوگی۔ مگر کسی کو اچھا سمجھنے کے لیے کوئی وقت معین تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی لمحے پیار کیا جاسکتا ہے۔ کیا خبر مستقبل کے ساتھ کیا ہے؟ یہ کیا ہوا، ہفتے میں صرف ایک بار ملنے کی پابندی لگا رہی ہو؟ کم از کم ہفتے میں دو بار تو سجدہ کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ایک بار تو ایسے ہی لگتا ہے جیسے لوگ جمعہ کے جمعہ نماز پڑھ لیتے ہیں..... باقی چھ دن کیسے گزریں گے؟ ذرا سوچئے، اور ہمارے کوٹے میں ذرا سا اضافہ کر دیجئے۔ یعنی ہفتے میں دو بار ملاقات اور یونیورسٹی میں معمول سے کچھ زیادہ کمپنی اور بس۔

جب تم کہہ رہی تھیں ”نہیں ہفتے میں صرف ایک بار“ تو میں سوچ رہا تھا اپنے مقدر بھی کیا خوب واقع ہوئے ہیں۔ پہلے تمہارے ڈیڈی کی مگرانی میں مقید رہے۔ وہاں بھی ”سی کلاسی“ تھے۔ وہاں سے رہائی ملی تو ہم نے خوشیاں منائیں۔ مگر سانس لیے بغیر سیدھے پھر قید میں پہنچ گئے۔ بیٹی کی قید میں! کچھ لوگ پیدا ہی قید کاٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔ سو کانٹیں گے میری سرکار، اپنے ڈیڈی سے کبھی پوچھ لینا، قید کاٹنے کے معاملے میں ہم کیسے ہیں؟ نہ کام چوری، نہ فرار، نہ معافی نامہ، تم سے بھاگ نکلیں، ممکن ہی نہیں.....

اگر تم بُرا نہ مناؤ تو پرسوں اتوار کے کچھ لمحے باہر کسی صحت انفرامقام پر گزارے جائیں۔ ٹھوکر

نیاز بیک کی جانب چل نکلیں گے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ یونیورسٹی یا شہر سے وہاں کوئی نہیں جاتا۔ یوں بھی کھلی جگہ ہے، شاہدہ کو ساتھ لیتی آنا، تم قلم دیکھنا اور میں تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ مجھے پتہ ہے تمہارے ٹیسٹ شروع ہیں۔ چلو وعدہ ٹھہرا سائیکالوجی ہی چلے گی..... نہ، نہ کیجئے گا۔ یوں کرنا، ہاشل کے پیچھے والی سڑک پر کوئی ایک بجے پہنچ جانا میں رکشہ لیے منتظر رہوں گا۔ تم نے کہا تھا طویل سا خط لکھنا۔ میرا خیال ہے، اب تمہیں خاصا 'بوز' کر لیا۔ رات ڈھل رہی ہے۔ میرے پاس ٹیپ ریکارڈ پڑا ہے۔ کمانڈر سے لایا تھا۔

جانتی ہو کون سا گانا بج رہا ہے؟ ”پھپھالودل میں یوں پیار میرا، کہ جیسے مندر میں لود دئے کی“ مجھے پہلے بھی یہ ریکارڈ بہت پسند تھا۔ مگر آج ان الفاظ سے نئے معانی پھوٹے محسوس ہو رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے جج جج تم گارہی ہو صرف میرے لیے..... موسیقی بھی کتنا خوب صورت دھوکا ہے!

تمہارا ہمیشہ

کنول

آج ہماری چھٹی ملاقات تھی لیکن جوں ہی تم باہر نکلیں، مجھے یوں لگا جیسے تم سے چھڑے سال بیت گئے ہیں۔ پھر اسی کمرے میں تنہا بیٹھے، کتنی دیر تک اوٹ پٹانگ سوچتا رہا۔ مجھے تو معاملہ بگڑتا نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے طوفان نوح دل کے دروازے توڑ کر باہر آیا ہی چاہتا ہے اور ایک دفعہ باہر تک پہنچ گیا تو پھر ساری کائنات اس میں ڈوب کر رہ جائے گی۔ ایک آتش فشاں ہے، جو بس پھٹنے کو ہے۔

تم بہت خوبصورت ہو۔ یقین کرو اگر خوبصورت نہ ہوتیں، تب بھی میں تمہیں اتنا ہی چاہتا۔ حسن تو ایک اضافی اور بے معنی شے ہے۔ میری آنکھ میں ہے نہ تمہارے جسم میں، بلکہ ان دونوں کے درمیان پیدا ہونے والے رشتے کے احساس کا نام ہے۔ اور یہ رشتہ ایسا ہے کہ جب تم گزرتی ہو تو اس دھرتی اور آکاش کا جیسے دم تک جاتا ہے۔ زمانے کی وسعتیں تمہارے قدموں تلے سمٹ آتی ہیں۔ تم اپنی گہری آنکھوں سے جب دیکھتی ہو تو ساری دنیا نشتے میں ڈوب جاتی ہے..... تم ہی بتاؤ اس میں میرا کیا قصور؟

تم نے کہا تھا ”مستقبل کے متعلق ابھی بات نہیں کریں گے“، ٹھیک ہے۔ بات نہ کرنا اور ہے مگر سوچنا..... اس سے قطعی علیحدہ شے ہے۔ اظہار بیان پر تو پابندی لگ سکتی ہے۔ مگر میرے ذہن پر بھی کوئی قفل لگا جاؤ، جو ہر لمحہ تمہارے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں۔ میں کیا کروں؟ تم ہی کچھ سوچو کوئی راستہ کوئی طریقہ کوئی حل..... کچھ کرو۔

پچھلے چند دنوں سے خوف کی ایک عجیب کیفیت مجھ پر ہر لمحہ چھائی رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کچھ حادثہ ہونے والا ہے کوئی تکلیف دہ سانحہ۔ جب تم اپنا سر میری چھاتی پر رکھو، میرے دل

کی دھڑکنوں میں اتر جاتی ہو۔ عین اُس لمحے بھی مجھے خوف رہتا ہے جیسے تم پھر کبھی نہ آؤ گی۔ جیسے یہ آخری ملاقات ہے، جیسے میں تمہیں کھودوں گا۔ ہاں جب تمہاری آنکھوں میں جھانکتا ہوں تو مجھے ہر جانب اپنے لیے پیار ہی پیار نظر آتا ہے۔ اسی وقت پل بھر کے لیے یوں لگتا ہے کہ تم مجھے کبھی نہ چھوڑو گی۔ مگر پھر وہی اداسی اور خوف ذہن پر قبضہ جمالیتا ہے۔

یہی دیکھو نا۔ آج صبح تم خرم کے ایک سیڈنٹ کی وجہ سے کچھ پریشان سی تھیں۔ مگر میں تمہیں پھر بھی اپنے ساتھ مزنگ لے گیا۔ بعد میں مجھے اپنی خود غرضی پر پشیمانی بھی ہوئی آخر تمہارا اُس کا دو سال سے ساتھ ہے اتنی گہری وابستگی ہے۔ اُسے دکھ میں دیکھ کر تمہیں خوشی کیسے ہو سکتی ہے؟ مجھے معاف کر دینا، میں تمہارے معاملے میں ذرا سا خود غرض ہو جاتا ہوں۔ کم بخت دل یہی چاہتا ہے کہ تم ہر وقت سامنے رہو۔ اس میں میرا بھی کیا قصور؟

یہ دل ایک ویران مندر تھا۔ جس میں صدیوں سے انتظار کے دیے روشن تھے۔ سنسان خاموشیوں اور اُجاڑا داسیوں کا راج تھا۔ تم نے اس ویرانے میں قدم رکھا تو جیسے زندگی کے ناقوس بج اُٹھے۔ بہاروں نے اپنا دامن پھیلا دیا۔ محبتوں کی سوندھی سوندھی مہک ہر جانب پھیل گئی۔ اس ویرانے کو دائم آباد رکھنا کہ تمہارے بعد یہاں کون لو بان کی خوشبو بکھیرے گا..... اپنے وجود کے پھول نچھاور کرے گا..... پھر کون یہاں نیم وا آنکھوں سے دیوی بن کر بیٹھے گا.....

رات بیت رہی ہے۔ ساری کائنات چپ کی چادر تانے خاموشی کے طوفان میں گم ہو چلی ہے۔ نیند کے خمار میں ڈوبی چاندنی ڈگمگاتے قدموں سے پھسل رہی ہے۔ شاید تم سوچ چکی ہو۔ اپنے ہاتھوں کو ایک بوسہ دے دینا، پہلی فرصت میں قرض اُتار دوں گا۔

تمہارا پجاری

۲ دسمبر ۱۹۷۷ء
۱۲۹۔ سرسید ہال

میری زندگی

جانتی ہو زندگی کتنی عزیز شے ہے؟..... بالکل تمھاری طرح۔ مگر ظالم بے وفا بھی کس قدر ہے۔ کسی لمحے اچانک دامن جھٹک کر چل دیتی ہے۔ جانے کس جانب؟ پھر لوٹ کر نہیں آتی۔ اس کے باوجود انسان اس سے پیار کرتا ہے۔ بے وفا چیزوں کی پرستش، انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس میں مجھ اکیلے ہی کا کیا قصور؟

یہ زندگی اور موت کا سلسلہ بھی عجیب ہے۔ کسی زمانے میں مجھے یقین تھا کہ موت کا اُن دیکھا پرندہ، خدا کی مانند آکاش کے اندھیروں میں بستا ہے اور کسی انجانے لمحے بھوکے عقاب کی طرح زندگی کے اُجالے کو جھپٹ لے جاتا ہے۔ تب میں موت سے بہت ڈرا کرتا تھا۔ ایک عرصے بعد مجھے احساس ہوا کہ موت تو میرے اندر موجود ہے۔ میرے وجود کا ایک ایسا امکان، جس کے بغیر زندگی کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ ہر آتی سانس میری زندگی بھی ہے اور موت بھی۔ یوں میں ہر لمحہ مر بھی رہا ہوں اور زندہ بھی ہوں۔ ہر مرتالہ نئے زندہ لمحے کو تخلیق کیے جاتا ہے۔ یہی زندگی کا زندہ پہلو ہے۔ تب موت سے میری دوستی ہو گئی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے مجبوری کی حد تک ناقابلِ جدا۔

پھر تمھاری یادوں کی کائنات سر پر رکھے، جب میں نے اپنی بیشتر سردراتیں، منہر کے کنارے چلتے چلتے گزار دیں تو میں نے پہلی بار زندگی کو ریگ ریگ کر مرنے دیکھا۔ مجھے اپنے اندر ایک بہت وسیع مدفن نظر آیا۔ جہاں چند ٹوٹی پھوٹی قبریں، کچھ کتبے اور میری اُن گنت لاشیں بے گورڈ کفن بکھری پڑی تھیں اور میں ہر لمحے اپنی نئی لاش ہاتھوں میں لیے ماضی کی لاشوں کے ڈھیر بن چکا ہوا تھا۔

روتی تنہائیوں کے جہوم میں، اپنے پچھڑے ’آپ‘ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھے کئی بار یوں لگا جیسے تمہارے بغیر زندگی ایک طویل اور بے معنی موت ہے۔ لوگ تو پاگل ہیں، جو سمجھتے ہیں، موت کا کوئی وقت معین ہے اور انسان کسی خاص دن کسی خاص لمحے مرتا ہے۔ انھیں کوئی سمجھائے کہ بے چارہ انسان تو زندگی بھر مرتا رہتا ہے۔ جسے دنیا موت سمجھے بیٹھی ہے وہ تو ایک ایسا مقام ہے، جہاں انسان مرنا بند کر دیتا ہے۔ جہاں موت کو بھی موت آ جاتی ہے۔ لوگ موت کے مرنے کا سوگ مناتے ہیں۔ مگر زندگی کے مرنے پر کوئی نوحہ نہیں پڑھتے۔ ہیں نہ دیوانے!!!!

آج صفر آیا تھا۔ ہم دونوں ہاسٹل کے ”کھوکھے“ پر بیٹھے رات گئے تک تمہارے متعلق باتیں کرتے رہے۔ پوچھ رہا تھا، ہم نے کب اُس کے گھر آنا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ ہفتے میں ایک دن ملتا ہے اور دونوں کے حساب سے بندھ پڑتا ہے۔ پھر پوچھنے لگا۔ ”تم اُس سے بہت پیار کرتے ہو؟“ میں نے کہا ”ہاں بہت، اتنا کہ میں خود بھی حیران ہوں۔ بس یوں سمجھ لو، انسان سے لے کر خدا تک جتنے رشتے ہیں، انھیں دوبار جمع کر لو تو میرا پیارا اُن سے کچھ زیادہ ہی ہوگا۔“ صفر کہنے لگا ”میں بھی مسرت سے بہت پیار کرتا ہوں۔“ میں نے پوچھا ”جب اُسے ملتے ہو تو سب سے پہلے کیا کرتے ہو؟“ صفر نے بتایا۔ ”اُس کی آنکھیں چومتا ہوں، پھر ہونٹ اور پھر.....“ میں ہنس پڑا اور کہا ”ہار گئے صفر۔ میں تو سب سے پہلے اُس کے پاؤں چومتا ہوں۔“ وہ حیران سا ہو کر میری جانب دیکھنے لگا جیسے میری بات کا اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔ میں نے کہا ”ہاں صفر ٹھیک ہے۔ پیار تو ہم دونوں ہی کرتے ہیں بس تھوڑا سا فرق ہے۔ تم کسی کے دیوتا ہو اور میں پجاری۔ تم جیت چکے اور میں.....“

صفر کیا جانے، جب تم چلتے چلتے رک جاتی ہو تو کائنات کی دھڑکنیں تھم جاتی ہیں۔ آبشاروں سے پھوٹنے لگتی اور جھرنوں کا مندر ہر مندر الپ تمہاری ہی مترنم مسکراہٹوں کی صدائے بازگشت ہے۔ تم کبھی اس زمین کے پیٹ پر ٹھوکر مار دو تو یہ غریب بھی میری ہی طرح خلاؤں میں بھٹکتی پھرے۔

ایک زمانہ تھا کسی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر ہنسی آ جایا کرتی تھی۔ میرا خیال تھا یہ باتیں محض استعارے ہیں، جن کا زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں سمجھتا تھا حقیقت

کے لیے ایک سی ہوتی ہے مگر اب مجھے احساس ہوا کہ ہر فرد کی کائنات اُس کی ذات کے تہ خانے سے ابھرتی ہے۔ بہت ممکن ہے میری کائنات کسی دوسرے کی دنیا سے مختلف ہو۔ شاید سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ حقیقت ایک سی نہیں ہوتی۔ ورنہ ساری دنیا کے مرد ایک ہی عورت سے پیار کیوں نہیں کرتے؟ اور پیار تو دو انسانوں کے درمیان باہمی رشتوں کا بہتا دریا ہے۔ ذرا سوچو تو، جب ہم پہلی بار ملے تھے ہمارا تعلق خاطر کتنا مختصر سا تھا آج بات کہاں تک جا پہنچی ہے؟ میں نے ہر گزرتے لمحے تمہیں پہلے سے زیادہ قریب پایا ہے اور تم نے مجھے۔

اور پھر حقیقت تنہا نہیں ہوا کرتی۔ یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ میں ایک چھوٹا انسان ہوں۔ ہم ایسے لوگوں سے مسرت کا ہر لمحہ چھین لینا اس دنیا کی بہت پرانی ریت ہے۔ اس رسم دنیا کو بدلنا بھی تو حقیقت ہے۔

اور یہ ”بڑے لوگ“!! انھیں کیا خبر، پیار کیا ہے؟ ان کے سینوں میں سنگ مرمر کے اہرام بنے ہیں۔ ان کے لیے عورت، ریز کی بے جان گڑیا ہے جسے وہ کارکی فرنٹ سیٹ پر لٹکا تے ہیں یا پھر وہ ڈرائنگ روم میں سجانیا صوفہ ہے۔ عورت کے گوشت کو نمک مرچ لگا کر کھاتے ہیں۔ شراب میں سوڈے کی جگہ حل کر کے پیتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری بوتل، نئے سے نیا گوشت، اچھوتا صوفہ..... مگر تم عورتیں بھی تو عیسیٰ کی بھیڑیں ہو۔ آنکھیں بند کیے بیٹھی ہو، جانے تمہیں کاروں کے اندر لٹکنے سے کیا ملتا ہے؟ جسے دیکھو وہ انسان کی بجائے بے جان گڑیا، بننے کی آرزو مند ہے۔

ہو سکتا ہے، تمہیں ہم مرد جانوروں نے ذہنی طور پر مفلوج بنا رکھا ہو مگر تم میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو اس جبر کے خلاف میدان میں آئے؟ کوئی ایسی نہیں جو بوتل بننے کی بجائے انسان بننا پسند کرے؟ کوئی ایسی جو کار کی بجائے اپنی ٹانگوں پر چلنے کے لیے تیار ہو۔

دوسری جانب ہمارے ’دانشور‘ حضرات ہیں جو الفاظ کے انبار تلے دبے بمشکل سانس کھینچ رہے ہیں۔ ان کی حالت سماج کے مندر میں روایات کے مقناطیسوں کے درمیان ہوا میں معلق بتوں کی سی ہے۔ سومات کی یہ نشانیاں تمہیں دانش گاہ کے ہر کونے میں معلق نظر آئیں گی۔ رسل نے ایک جہت کہا تھا ”جب کسی دانش گاہ کے کونے میں مجھے کوئی نوجوان جوڑا نظر آتا ہے تو مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ حسین وقت ہے۔“

بے چارہ بوڑھا فلسفی! اور بہت سی باتوں کی طرح پیار کی دنیا کو بھی نہ سمجھ سکا۔ سچ پوچھو تو وہ خود بھی ایک بت تھا۔ ذرا سا غیر متوازن بت۔ پوری عمر اُسے آرزو ہی رہی، کہ کوئی عورت اُس سے پیار کرے۔ مگر سوائے اپنی بیوی کے کسی عورت کا گداز سایہ اُس کے جسم پر نہ پڑا۔ کوئی اُسے قبر کی آغوش سے کھینچ کر واپس لائے تو میں اُسے بتاؤں، کہ 'دانشوروں' کی پیار جوانی کے جن زرد لمحات کو وہ امر کہتا پھرا، اُن کی حقیقت کیا ہے؟ دُور کسی کونے میں بیٹھی ہوئی یہ عجیب جنس زندگی کو خشک تصورات کے بوجھ تلے دبائے کی جستجو میں اپنا جھجھکی جاتی ہے۔ بتوں کی یہ حسین وادی نامرد اور ناعورت مجسموں کا عجائب گھر ہے۔ ان میں سے ہر بت اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ دنیا بال کھولے اُس کے ایک اشارے کی منتظر بیٹھی ہے۔ عشق و محبت کی وادیاں اُسی کے دم قدم سے آباد ہیں۔ بے چارے لوگ! مجھے ان سب سے نفرت ہے۔ ان شاعروں نے بادشاہوں کی مدح میں قصیدے لکھ کر الفاظ کا چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ ادیبوں نے جھوٹے افسانے تراش تراش کر، معافی کی دنیا ویران کر دی ہے۔ ان کے الفاظ و معنی کا تنگ قافیہ میرے جذبات و احساسات کا بوجھ سہارنے سے معذور ہے۔ عشق و محبت کی بے جان روایتیں، میری محبت کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں۔ ان الفاظ کے درمیان میرے معافی نہیں سا پاتے انھیں ڈھونڈنا چاہتا ہوں تو وہ تمھیں الفاظ سے آگے ملیں گے۔ شاید پھر تم محسوس کر سکو کہ میرا پیار بھی روایات سے مختلف ہے اور میری نفرت بھی۔ شاید تمھیں پتہ چل جائے کہ میں ان تپتے صحراؤں میں آسان کی جانب سر کیے صنوبر کے تنہا درخت کی مانند کھڑا ہوں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنوں میں انجانی آہنیں سنائی دیتی ہیں۔ کسی نئے زمانے، نئے دور کی اجنبی آوازیں، نئی محبتوں کے گیت..... شاید تمھیں ان کا بھی کوئی سراغ مل پائے۔

گلتا ہے۔ شاہدہ سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہے، اُس کے بغیر اکیلے اکیلے تم کچھ آدھی سی لگتی ہو۔ میں نے آج پوچھا بھی مگر تم ہنس کر ٹال گئیں۔ بھلا اتنے اچھے لوگوں سے بھی کوئی ناراض ہوا کرتا ہے؟

ہاں سنو، پرسوں شام میٹنگ پر تم ضرور آنا۔ بنگلہ دلش والے مسئلے پر بحث ہوگی۔ مجھے پتہ ہے تم کچی بنگلہ دلش ہو۔ ارے بھائی لوگو، میں بنگالیوں کا دشمن کیسے ہو سکتا ہوں؟ بلکہ دوست ہے کہ ہم "جماعتیوں" کو دبوچیں مگر مصیبت یہ ہے کہ تم سارے لوگ مجھ پر انتہا پسندی کا گماں لگا

دو گے۔

دنیا میں، اس زندگی میں الغرض کارزار کائنات کے کسی گوشے میں انتہا نام کی کوئی شے نہیں ملتی۔ ہم جسے انتہا کہتے یا سمجھتے ہیں وہ دراصل کسی نئے موڑ کی ابتدا ہوتی ہے۔ میں نئے موڑ سے آواز لگا رہا ہوں، نا سمجھ اسے انتہا سے موسوم کر دیتے ہیں۔
پرسوں ملاقات ہے اور ہم ابھی سے تیار بیٹھے ہیں۔

پیار

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

۸/دسمبر ۱۹۷۲ء

۱۲۹-سرسید ہال

کنول

آج کا دن کتنا مبارک تھا کہ ہاسٹل میں بیٹھے بیٹھے ہی تمہارے درشن ہو گئے۔ تمہاری فوج کے سارے سپاہی تمہارے جلو میں تھے۔ صرف ایک شاہدہ نہ تھی شاید انجینئر کے چرنوں میں بیٹھی مستقبل کے حسین نقشے بنا رہی ہوگی۔ یونیورسٹی بند ہو تو ”بچہ لوگ“ یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ یوں تو اشرف بہت کم گوا اور سخت سخت سا آدمی لگتا ہے مگر شاہدہ بھی آخر راجپوتی ہے۔ پیارا اور جنگ دونوں میں یکتا۔ بھلا اُس سے کون جیت سکتا ہے؟

کوئی دس بجے کے قریب شجاع والے ہاسٹل میں گیا۔ وہاں سے تمہارا کمرہ صاف نظر آتا ہے۔ اُس وقت تم صبیحہ کے ساتھ ہاسٹل کے سامنے سائیکل چلانے میں لگی تھیں۔ پتہ ہے میں نے تمہیں دور بین سے دیکھا تھا۔ یہاں ایک لڑکے کے پاس بڑی نفیس دور بین ہے۔ جو ہمہ وقت کسی نہ کسی لڑکے کی آنکھ پر ہوتی ہے۔ چھٹی والے دن لڑکیاں نہاتی دھوتی ہیں، کپڑے بدلتی ہیں اور یار لوگ دور بین سے یہ کارروائی دیکھ کر اپنا دل پشوری کرتے ہیں۔ اندازہ کرو کتنی طاقتور دور بین ہے مجھے تمہارے کمرے میں سامنے والے دروازے کی بائیں جانب بجلی کے بٹن سے ذرا اوپر، کسی بچے کی تصویر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سٹڈی ٹیبل پر کتابیں بچی تھی، قریب ہی کسی عورت کی فریم لگی فوٹو تھی۔ غالباً تمہاری بڑی بہن کی، اور وہاں پھولوں کا ایک گل دستہ بھی گلاس میں لگا تھا۔ باہر بالکونی میں ٹیبل پر استری کھڑی تھی اور ساتھ ہی استری کیے ہوئے جوڑے ترتیب سے لگے تھے۔ کیوں تھا مناسب کچھ؟

تم سے پانچویں نمبر والے کمرے کی لڑکی کپڑے بدل رہی تھی۔ غریب کے پاس بٹن ایک ہی آزار بند ہے وہی اُس نے دوسری شلوار میں ڈالا۔ اتنی سوکھی لگ رہی تھی کپڑوں میں ماز

بہتر لگتی ہے۔ مجھے تو کوئی خاص کشش محسوس نہ ہوئی۔ جانے لوگ کیوں ہر عورت کو نگاہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ نگاہ ہونا، ذرا سی نئی بات ضرور ہے مگر ایسی بھی نہیں کہ سانس ہی پھول جائے۔

میں نے دور بین دوسری منتظر آنکھوں کے حوالے کر دی۔ چنانچہ بہت سے حضرات نے اس منظر پر آہیں بھریں۔ ایک لڑکا بتا رہا تھا اُس نے تم لوگوں کے ہاسٹل میں کوئی ”نئی دنیا“ دریافت کر رکھی ہے۔ جہاں اُلٹی نگاہ بتی ہے۔ کوئی دو لڑکیاں ہیں، جن کے نام نہیں بتا رہا تھا۔ میرا خیال ہے، وہی جوڑی ہے جس کے متعلق تم نے بھی بتایا تھا۔ اب ذرا دیکھو ان دونوں کو پورا دن برقعہ لپیٹے یوں پھرتی ہیں جیسے بس ابھی ابھی حج سے لوٹی ہوں۔ اس سے تو بہتر ہے وہ کسی لڑکے سے ہی گپ لگا لیا کریں۔

شجاع والی ونگ میں تمہارے بہت سے نام لیوا بستے ہیں ’مٹلک‘ بھی اور تمہارا وہ ”سٹنٹ مین“ بھی جو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہمیشہ تمہارا تعاقب کرتا رہتا ہے۔

خرم نے کب واپس جانا ہے؟ ویسے پوچھنا فضول ہی ہے کہ وہ جاتے کم اور آتے زیادہ ہیں۔ افسری بھی کیا نعمت ہے۔ ہر ہفتے دس دن کے سرکاری دورے پر لاہور آ جاتے ہیں اور جب دُور ہوں ہر شام بنام سرکار تمہیں ٹرنک کال ہوتی ہے۔ بحیرہ عرب کے دہیل والے ساحل سے ہم ساغریب تو سالوں نہ لوٹ سکے۔ میری جان فاصلے صرف غریب کے لیے ہوا کرتے ہیں۔ دولت تو زمین کی طنائیں کھینچ دیتی ہے۔ ہم تمہارے قریب رہ کر بھی دیکھنے کو ترستے ہیں اور وہ ساحل دہیل پر ہوتے ہوئے بھی کتنے قریب۔

میں نے خرم کو ابھی تک نہیں دیکھا۔ جب کبھی اُس کی کار گزرتی ہے میری آنکھیں..... خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ مجھے اُس سے رقابت تو ہوگی مگر اس کی نوعیت بہت عجیب سی ہے۔ لفظ رقیب سے وابستہ معانی شاید اس کیفیت کی ترجمانی نہ کر پائیں۔ مجھے اُس شخص سے بالکل نفرت نہیں ہوتی۔ میں نے کئی بازار اکیلے لیٹے اپنے تخیل کے کیوس پر اُس کی تصویر اُتاری ہوگی۔ بہت خوبصورت سا خاکہ کھینچا ہوگا۔ آخر تمہاری قربت سے آشنا ہے کوئی ہم سا عام آدمی تھوڑے ہی ہوگا؟

میرے اندر کبھی ایک وحشی مرد ہوا کرتا تھا۔ روایتی رقابتوں کا قائل، بے معنی محبتوں کا

پرستار، بات بات پر مرنے مارنے کے لیے تیار۔ ایک شام میں نے اُس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اُسے ماضی کے دریا میں پھینک دیا۔ جیسی خرم سے میرا رواجی بھگڑا نہیں۔

مجھے اُس سے صرف یہ لگہ ہے کہ وہ مجھے تمھاری قربت سے محروم کر دیتا ہے۔ جب تک وہ یہاں رہتا ہے تبھائیاں سر پر بازور رکھے میرے ارد گرد بین کرتی رہتی ہیں۔ ان دنوں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم ایک ایسی ماں ہو جس نے ایک بیٹا تو دنیا کے رواج کے مطابق جنم دیا۔ اُسے تم اٹھائے اٹھائے پھرتی ہو۔ اُس کے ماتھے پر سیاہ نشان لگاتی ہو کہ وہ نظر بد سے بچا رہے۔ لوگوں سے اُسے ملواتی ہو، گھنٹوں اُسے ساتھ لیے رہتی ہو۔ مگر مجھے ایک ایسا بچہ بنا دیتی ہو، جسے تم نے بن باپ کے پیدا کیا تھا۔ مجھے دنیا کے سامنے اپنا کہنے سے شرماتی ہو۔ اُس کی موجودگی میں تم مجھے روتا دھوتا چھوڑ کر چل دیتی ہو۔ پھر دنیا کی نظروں سے بچ بچا کر اندھیروں میں منہ لپیٹے پل دوپل کے لیے مجھے بہلانے کے لیے آجاتی ہو۔ خرم میرے وجود کو ناجائز بنا دیتا ہے۔

میں تم سے جتنا پیار کرتا ہوں، زمانہ اس کا بدل شاید کبھی پیدا نہ کر سکے۔ مگر میں نے کبھی تمھیں خرم کے ساتھ ملنے سے روکا اور نہ کبھی کہا کہ اُسے میری وجہ سے چھوڑ دو۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں یہ میرا حق ہے۔ تم کسی کو پسند کرو، یہ تمھارا بنیادی حق ہے۔ خرم اُس قدیم دنیا کا باسی ہے جو صرف اپنا حق تسلیم کرتی ہے۔ جہاں دوسروں کو اپنی چھوٹی سی خواہشات پر قربان کر دینا ثواب سمجھا جاتا ہے۔ جہاں عورت کو ذاتی زمین کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ تو ابھی سے زمین کا مالک بنا بیٹھا ہے۔

میں جنسی آزادی سے خوف زدہ نہیں۔ لوگوں نے اس لفظ کے ساتھ بہت سے غلط معنی وابستہ کر رکھے ہیں۔ پہلے تو وہ جنس اور پیار کو دو متضاد چیزیں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بغیر کسی باہمی پسندیدگی کے، فریضہ ازدواج کے نتیجے میں بچے پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جنسی آزادی کا نام سنتے ہی اُن کے ذہن میں پہلا خیال یہ آتا ہے کہ شاید برہنہ عورتیں ہر چور اُسے پر اُن کی منتظر ہوں گی۔ جہاں روپے پیسے دیئے بغیر کام چلے گا۔ انھیں بنیادوں پر لوگ جنسی آزادی کی حمایت بھی کرتے ہیں اور مخالفت بھی۔ میں ان دونوں سے متفق نہیں۔ ایسی سوچیں صرف جنسی اشتہا کی نمائندگی کرتی ہیں۔ میرے نزدیک دنیا میں کوئی ایسی آزادی ممکن نہیں جو غیر مشروط ہو۔ حتیٰ کہ صرف سوچنے کی

آزادی کے لیے بھی ذہن و شعور کا ہونا اولین شرط ہے۔ جنسی آزادی کے لیے باہمی پسندیدگی لازمی شرط ہے اور اس کے نتائج کی ذمہ داری دوسری شرط۔ (ہمارے ہاں جنس صرف نتائج سے وابستہ ہے، جیسا کہ یہاں شدید گھٹن کا عالم ہے۔)

زندگی کے سمندر کا احاطہ ممکن نہیں۔ انسان اپنے زندہ لحظات کو زیادہ سے زیادہ حسین بنانے کا خواہش مند رہتا ہے۔ وہ زندگی کا دامن رنگ و بو سے بھر دینا چاہتا ہے۔ ذرا سوچو تو آج ۱۹۷۲ء ہے۔ آج سے صرف سو سال پہلے انہی جگہوں پر کوئی لوگ بستے ہوں گے۔ اُن کے بھی مسائل ہوئے ہوں گے۔ بہت سوں نے ایک دوسرے کو چاہا بھی ہوگا۔ ہماری طرح چھپ چھپ کر ملے بھی ہوں گے، آج تہ خاک ہیں۔ کوئی نہیں جانتا وہ کون لوگ تھے؟ میں نے اکثر یونیورسٹی کے حسین برآمدوں میں بیٹھ کر اُن لوگوں کے متعلق سوچا ہے۔

یقین جانو، ۲۰۷۲ء بھی آئے گا۔ ٹھیک آج کے دن انہی جگہوں پر جانے کون لوگ کھڑے ہوں گے۔ ان کے بھی مسائل ہوں گے۔ باہمی پیار و محبت کے تذکرے ہوں گے اور ہمیں، ہم سب کو کوئی اُسی طرح نہ جانتا ہوگا جیسے آج ہم آگلوں سے وقف نہیں ہیں۔ اُس وقت ہم تہ خاک ہوں گے۔ اگر انسانی زندگی کا حدود اربعہ صرف اتنا ہے تو تم ہی سوچو، پیار کے چند لحظات جو ہمیں میسر ہیں انھیں کیوں ضائع کریں؟ زُسوم کا زہر پی پی کر کیوں گلتے رہیں؟ اندھی روایتوں کے دائرے میں کیوں مقید رہیں؟ اور لوگوں سے کیوں ڈریں؟

میں اور تم اتنے مختصر ہونے کے باوجود اِس کائنات کی سب سے قدیم شے بھی ہیں۔ اُن گنت گزری صدیوں کی تمہیں ہمارے اندر لگی ہیں اور آنے والی جانے کتنی صدیوں کی قوت ہمارے اندر چل رہی ہے۔ جانے کتنے لوگ ہماری کمر میں ریگ رہے ہیں۔ ہم حیات انسانی کے اِسی تسلسل کے امین ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا کرتا ہوں ”ہم صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔“ اور سنو، اس ساتھ کے لیے ہم اپنے سوا کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔

میں غربت کی بادِ سموم میں گھرا، ایک عام آدمی ہوں۔ میری یہ خواہش نہیں کہ ۲۰۷۲ء میں بسنے والے میرا نام یاد رکھیں۔ یادیں اور نام تو بہلا دے ہوتے ہیں۔ میں اُن کے لیے کوئی بہلا و اچھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ غربت و افلاس، خوف و دہشت اور محرومیوں کی بجائے میں اُن تک

صرف انسانی زندگی منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ یہی وہ آدھی سچائی ہے، جس کی میں بات کیا کرتا ہوں۔ اُن نئے لوگوں کو اپنی روایات خود بنانی ہیں۔ پیار و محبت کی روایات، آزادی اور برابری کی روایات.....

کہہ سکتی ہو میں خوابوں کی دنیا کا مکین ہوں۔ میری باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر کبھی تم نے بھیٹر کو ذبح ہوتے دیکھا ہے؟ اُس وقت اگر تمہیں کوئی بتائے کہ وہ تمہارے لیے شاندار جوتی بنا رہا ہے اور تم نے یہ جوتی پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ تم کہو گی ”اس آدمی کا دماغ چل گیا ہے“..... اسی طرح لوگ مجھے بھی دیوانہ کہہ دیتے ہیں۔

اگر ۲۰۷۲ء میں چند لمحوں کے لیے مجھے دوبارہ زندگی مل جائے تو میں اُن نئے لوگوں سے صرف ایک بات کہوں کہ بیسویں صدی انسان کے خلاف نفرتوں کی صدی تھی جہاں مرنا بھی دشوار تھا اور زندہ رہنا بھی۔ اور نفرتوں کا یہ عالم تھا کہ پیار بھی چھپ چھپ کر کرنا پڑتا تھا.....

ہاں جی، آج شام تم نظر نہ آئیں۔ باہر نکلا تو ”صبیحہ سنتوش“ کی جوڑی، نپلی پر جمی تھی۔ حسب عادت انہوں نے چھیڑا بھی مگر میں سر جھکائے گزر گیا۔ تم اُن کے ساتھ نہ تھیں۔ اُن سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے سوچا ہوگا میں بیمار ہوں، یا پھر اُن سے ناراض، جیسی انہوں نے تم سے ”شکایت“ لگائی ہے۔ لگی دنیا اپنے درد کو کیا جانے؟

شام ساڑھے آٹھ کے قریب تمہیں فون بھی کیا۔ تم نہ تھیں۔ کوئی لڑکی فون پر تھی۔ کافی دیر گپ لگاتی رہی۔ پوچھتی رہی کون ہو، کیا کرتے ہو، کیا شکل ہے، تمہارے ہاتھوں کی انگلیاں کیسی ہیں، قد کتنا ہے، رنگ کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اُس سے پوچھا ”تم یہ سب کیوں جاننا چاہتی ہو؟“ کہنے لگی ”فون پر تمہاری آواز بڑی پیاری لگتی ہے۔“

میں نے اُسے کہا کہ اُس نے اگر شکل دیکھ لی تو پھر روتی پھرے گی۔ جب میں فون بند کرنے لگا تو اُس نے کہا، ”اگر تم بہت مصروف نہیں ہو تو چند منٹ اور باتیں کر لیتے ہیں.....“ اور اپنا رنگ، ناک نقشہ بتانے لگ پڑی کہ وہ بہت ہی بد صورت ہے۔ اُس کی شکل حبشیوں جیسی ہے۔ بہت نالائق ہے اور اس قسم کے دوسرے مذاق کرتی رہی۔ میں نے بمشکل اُس سے جان چھڑائی۔ فون پر یہ لڑکیاں اتنا تنگ کرتی ہیں، خدا ہی بچائے۔ کئی دفعہ تو گھروں سے یہاں لڑکوں

کے ہاسٹل میں ٹیلی فون کرتی ہیں۔ جو بھی اُن کے ہاتھ لگ جائے اُسی کا دماغ چائنا شروع کر دیتی ہیں۔ لڑکے بھی یہی حرکت کرتے ہوں گے۔ جیسی ہمارے ہاسٹلوں کے ٹیلی فون ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔

عام زندگی پر پہرے ہیں۔ عورت اور مرد اپنی مرضی سے ایک دوسرے کے ساتھ مل نہیں سکتے۔ معاشرتی بندھنوں کی زنجیریں ہیں۔ ناروا پابندیاں ہیں۔ اخلاقی ضوابط ہیں۔ غیر انسانی بندشیں ہیں۔ بے چارے لوگ کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ بس فون پر ہی گپ شپ لگا کر ایمان تازہ کرتے ہیں اور جنہیں فون کی عیاشی میسر نہیں، وہ اپنے ذہن کے پردوں پر بلیو پرنٹ چلاتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے خیالات کی دنیا بساتے ہیں اور اپنی اپنی پسند کے مردوں اور عورتوں کو اپنے پہلو کی زینت بناتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق اُن سے مکالمے ادا کراتے ہیں اور یوں فطری خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔

اپنی سوسائٹی اُن باتوں پر شرمندہ ہو جاتی ہے جن پر نہیں ہونا چاہیے لیکن اُن باتوں پر قطعاً شرمندہ نہیں ہوتی جن پر اُسے شرمندہ ہونا چاہیے۔ مثلاً عورت اور مرد کا ملاپ فطری حقیقت ہے۔ اس حقیقت سے شرمنا ایک غیر فطری رویہ ہے۔ لیکن رشوت، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور دولت کے انبار بغیر شرمائے اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ ان بُرائیوں پر کوئی شرمندہ نہیں ہوتا۔

میں مانتا ہوں، انسان کو اپنی پیدائش پر کوئی اختیار نہیں۔ وہ کسی معاشرے، کسی مذہب، کسی طبقے اور کسی بھی فرد کے ہاں جنم لینے پر مجبور ہے۔ وہ اپنی مرضی یا خواہش کے بغیر جنم لیتا ہے۔ ہم تم اسی طرح مختلف لوگوں کے ہاں پیدا ہوئے۔ لیکن انسان کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے ماحول، اس کی اخلاقیات اور اس کی بندشوں کو قبول کرے یا پھر انھیں رد کر دے۔ یہ ضروری نہیں، میں وہی کچھ کروں، جو میرا معاشرہ کہتا ہے، یا کرتا ہے۔ میں اُسے ہی حقیقت سمجھوں جسے لوگ حقیقت سمجھتے ہیں۔ میں بھی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لوں، کیونکہ یہی میرے ماحول کا دستور ہے۔ میں زندگی کی ہر حقیقت کو پرکھنا چاہتا ہوں، میں ان رسوم روایات کو جانچنا چاہتا ہوں۔ ان کے مطالب معافی سمجھنا چاہتا ہوں۔ اور پھر انھیں قبول کروں یا رد کروں، یہ میرا اختیار ہے۔ یہی میری آزادی ہے۔ میں اندھے عقیدوں کا قائل ہو کر یہ آزادی کھونا نہیں چاہتا۔

جو لوگ دی ہوئی صورت حال کو من و عن قبول کر لیتے ہیں۔ جو لوگ حادثہ پیدائش کی بنا پر ہندو یا مسلمان ہوتے ہیں، وہ دراصل بڑے قابل رحم لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر ہندو کے ہاں جنم لیں تو راشٹریہ سیکو سنکھی اور بد قسمتی سے واہگہ کی اس جانب ہوں تو جماعت اسلامی والے کہلاتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ مسلمان کیوں ہیں اور نہیں سوچتے کہ وہ ہندو کس لیے ہیں۔ اگر حادثہ پیدائش کا اتفاق اس سے اُلٹ ہوتا، تو باجپائی آج مولانا طفیل محمد ہوتا اور مولانا اتنے ہی کٹر ہندو..... اور دونوں اسی شد و مد سے خدمت دین میں مصروف ہوتے..... یہ سوچے بغیر کہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ صحیح ہے یا غلط۔

جو لوگ بندشوں کو صداقت جان کر ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، وہ غیر فطری طریقوں سے فطرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اندھی روایات کی تنگ قبروں میں اتارنے کو خدائی خدمت سمجھتے ہیں۔ ایسے آدمی اندھیرے میں جو کچھ کرتے ہیں، روشنی میں اس پر تبرا بھیجتے ہیں۔ ان کی ذات کے کئی روپ ہوتے ہیں اور ہر روپ دوسرے کے برعکس ہوتا ہے.....

وہ اپنی آدمی زندگی خود کو فریب دینے میں ضائع کر دیتے ہیں اور بقیہ آدمی اس فریب کو صحیح ثابت کرنے کی سعی ناکام میں۔ خود فریبی کے سمندر میں ڈوبے اس قبیلے کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر جنت میں داخل ہونے کی بجائے اپنے قدموں پر چل کر دوزخ میں جانا پسند کروں گا۔

اس سماج میں اگر صداقتوں کو محسوس کرنا چاہو تو کسانوں کی کسی بستی میں چلی جاؤ۔ تمہیں یقین آجائے گا کہ اُن کا اندر اور باہر ایک ہے۔ اُن کے عقیدے کتنے سادہ ہیں اور زندگی کے لیے اُن کی اپروچ زندگی سے کس قدر قریب ہے۔ اُن کا پیارا کتنا براہ راست ہے اور وہاں مرد اور عورت کا رشتہ فطرت کے کتنا قریب ہے۔

ہاں یاد آیا، تم نے فلاسفی آف ایجوکیشن پر نوٹس مانگے تھے۔ میں نے اپنے شعبہ فلسفہ کے اساتذہ کو ٹولا ہے وہ سب بھی اپنی مانند اس معاملے میں کورے، کنوارے اور معصوم ہیں۔ ہمارے یہاں یہ انتہائی اہم مضمون سرے سے پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ ہے نا حیرت کی بات؟ لیکن ہم فلسفی

ہیں اور ہمارے اساتذہ ٹھہرے ہمارے بھی اُستاد۔ وہ ہمیں فلسفہ کے سوا ہر شے پڑھاتے ہیں اور ہم پڑھنے کے سوا سب کام کرتے ہیں۔ لہذا انتہائی سکون اور کمال ہم آہنگی سے یہ سلسلہ چل رہا ہے، اور جانے کب تک چلتا رہے گا۔ تاہم تم گھبراؤ نہیں، مجھے اس مضمون پر چند کتابیں میسر آ گئیں ہیں، تمہیں بھیج دوں گا۔ کام چلا لینا۔

لکھتے لکھتے ہاتھ بھی تھک گیا ہے۔ اب اجازت دو۔ پیار..... پیار..... پیار

بہت سا پیار

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

۱۹ دسمبر ۱۹۷۷ء

۱۲۷- سرسید ہال

دیوی رانی

لو تم بھی کیا ضدی چیز ہو، ذرا سی بات پر رو رو کر اپنا دمہ حال کر لیا۔ شاہدہ بھی تیار ہی تھی کہ تم رات بھر سسکیاں لیتی رہیں۔ تمہیں اپنی آنکھوں کی قسم اب بس بھی کر دو، بھول بھی چکو۔

میں نے فلرٹ کہا۔ مانتا ہوں نہیں کہنا چاہیے تھا اور میں اگر کسی غلط فہمی کا شکار ہو ہی گیا تھا تو پھر تم ہی نے ہمیشہ کی طرح حوصلے سے کام لیا ہوتا۔ تمہیں کیا ہو گیا تھا تکیہ منہ پر لیے پورے دو گھنٹے تم روتی رہیں۔ بار بار ایک ہی پاپات کہے جا رہی تھیں ”آپ مجھے چھوڑنا چاہتے ہیں“ اور میں وہ سارا وقت تمہیں چپ کراتے کراتے، خود بھی روہا نسا ہو گیا۔ صفر بے چارہ الگ پریشان ہوا۔ بلکہ آج تمہاری خبر لینے کیسپس بھی آیا۔ تم تو رو پیٹ کر اپنا بوجھ ہلکا کر رہی ہو اور ہم جنہیں رونے کی عادت نہیں، اس حالت میں کیا سو بھی سکے ہوں گے؟

پگلی! میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا؟ خود ہی سوچو یہ ممکن ہے؟ میں نے اپنی زندگی کی ساری آرزوئیں یکجا کر کے تمہارا بت بنایا ہے۔ آسمانوں سے زیادہ بلند اور ستاروں سے زیادہ حسین۔ اسے چھو کر اپنے وجود کو نئے معنی دیتا ہوں، اسے دیکھ کر اپنے حوصلوں کو جوڑتا ہوں اور جب اس بت پر کوئی خراش آجاتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے نیچے سے زمین سرک گئی ہو، فضا میں تحلیل ہو گیا ہوں۔ تمہیں میری پرستشوں کی قسم اس بت پر خراش نہ آنے دیا کرو۔

میں ایسا شخص ہوں کہ بلا جواز دوسرا سانس کھینچنا بھی گوارا نہ کروں۔ میرے پاس یہ جواز تم سے پہلے بھی موجود تھا۔ مگر تم نے اس کی تکمیل کی ہے۔ تم میری ضرورت ہو، میں پھر سے ادھورا نہیں ہونا چاہتا۔

اور ہاں گالی میرے منہ سے نکل جایا کرتی ہے۔ بُرا نہ منایا کرو۔ یہ بیماری مجھے ورثے میں

ملی ہے اور پھر گالیوں کے معنی نہیں ڈھونڈا کرتے، یہ صرف سننے کے لیے ہوتی ہیں یا پھر ہوا میں تحلیل ہونے کے لیے۔

ویسے کچھ تو تمہاری بھی غلطی تھی۔ تم لوگوں کا جو بھی پروگرام تھا بتا دینا چاہیے تھا۔ جب ہم سبھی کھانا کھا رہے تھے تو تمہاری سہیلیوں اور خان کے درمیان اشارے چلے۔ میں نے سوچا ان لوگوں کا کوئی پروگرام ہوگا جو شاید میری وجہ سے گڑبڑ ہو رہا ہے۔

کھانے کے بعد جی میں وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ تم نے پھر بٹھالیا کہ 'بونک' کے لیے چلیں گے۔ ابھی چائے ختم نہ ہوئی تھی کہ تمہاری سہیلیاں جاسوسی فلموں کے کرداروں کی طرح اس لڑکے سمیت غائب ہو گئیں، ایک زہ گئی تھی وہ تمہیں لے کر چل دی۔

میں ابھی کینے بیڑیا میں ہی تھا۔ اظہر اندر آیا اور دوسری میز پر بیٹھے اپنے ساتھی کو تم لوگوں کے متعلق بہت گندی سی کوئی بات بتانے لگا۔ میں نے اُسے قریب بلا کر منع کیا۔ تاہم مجھے بہت صدمہ ہوا۔ تم دن کے اُجالے میں میرے ساتھ پھرتے ہوئے گھبراتی ہو، حالانکہ خرم کے ساتھ پھرتے ہوئے تمہیں کوئی خوف نہیں آتا۔ رات کے اندھیروں میں ایک تیسرے لڑکے کے ساتھ درختوں کے درمیان چھپ چھپ کر 'کش' لگانے سے تمہاری عزت میں جیسے اضافہ ہوتا ہے۔ سارے خوف، ساری بدنامیاں، ساری پابندیاں کیا صرف میرے ہی لیے ہیں؟ تمہارے ساتھ پھرتا رہوں اور لوگوں کے سامنے تم سے اتنا بھی کہہ نہ سکوں "کل باہر جانا"۔ ہر شام خط لکھوں اور فرسٹ ایئر کے لڑکوں کی طرح کتابوں میں چھپا چھپا کر تمہیں دوں۔ "صبح کو پتہ نہ چلے"۔ "خرم سے کوئی کہہ دے گا۔ اُسے شک پڑ گیا ہے"۔ "گلشن کو نہ بتانا"۔ میرے لیے تم نے ہر قدم پر کئی خرم کھڑے کر رکھے ہیں۔ تمہاری خاطر اس جھوٹے ماحول میں کتنا جبر کر کے جھوٹ بولتا ہوں۔ اگر میں کسی ایسی دنیا میں آ ہی گیا ہوں، جہاں لوگ میری طرح نہیں سوچتے تو اس میں میرا کیا گناہ کہ تم سبھی لوگ اپنے مقام پر مجھے سزا دینا کا رِثا ب جانتے ہو۔ میں نے تمہیں اچھا سمجھا ہے کوئی ڈاکہ تو نہیں ڈالا؟ رات بھر میں یہی کچھ سوچتا رہا پھر غصہ تو آنا تھا۔

مجھے پتہ ہے تمہارا اُس لڑکے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور جس کے ساتھ ہے میں نے تمہیں اس سے کبھی نہیں روکا۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے تم لوگ شوقیہ طور پر چرس کا ذائقہ محسوس کرنا چاہتے تھے۔

مجھے کہتے تو میں لا دیتا۔ تم نے کون سا نشہ ہی لگا لینا تھا۔

ٹھیک ہے، میں آزادی کا قائل ہوں، مگر چرس پینا بھی کوئی آزادی ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی زہر کھائے اور کہے میں بغاوت کر رہا ہوں۔ چرس کے دھوکے سے کیا سماج کے جاہلانہ رشتے ٹوٹ جائیں گے؟ بتاؤ نا، کیا تبدیلی آجائے گی؟ چند لمحے ذہن کے پردوں پر زہر کے نشتر چلانے سے ہمارا ذہن ماؤف ہو سکتا ہے باہر کی دنیا نہیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے بکری بھیڑیے کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے اور فرض کر لیتی ہے کہ ”بھیڑیا اب اُسے نہیں دیکھ سکتا“۔ میری جان، یہ بزدلی کی انتہا ہے۔

اس سرزمین کے لوگ صدیوں سے چرس پیتے آئے ہیں۔ دیکھ لو انھیں کتنی آزادی میسر ہے؟ جب میں کسی پرانی گلی کے کونے سے چرس کا دھواں پھیلنے دیکھتا ہوں تو مجھے ان پر بہت رحم آتا ہے۔ جب بڑے لوگوں کے بچے اسے ’حشیش‘ کہہ کر پیتے ہیں تو مجھے ان سے نفرت آتی ہے۔ یہ لوگ چرس اس لیے پیتے ہیں کہ مغرب میں آج کا دستور یہی ہے۔ صاحب لوگ ہیں بُرائی بھی ’ولایت پلٹ‘ کرتے ہیں۔ چرس پینا ہی اپنے لوگوں سے سیکھ لیتے تو کوئی بات بھی تھی۔

’حشیش گروپ‘ دن بھر بغاوت اور آزادی کے نعرے لگاتا ہے اور حالت یہ ہے کہ ادھر پٹاٹے کی آواز آتی، ادھر اُن کا نشہ ہرن ہوا۔ پھر کئی کئی دن کمروں سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر جملہ قیامت اور خود لذتی کے مشترکہ مقابلے کا نام آزادی ہے تو پھر یہ لوگ بہت آزاد ہیں۔

چلو اب تم نے کش لگا لیا۔ تمہیں محسوس ہوا ہوگا ندیاں جیسے دریا بن گئی ہیں، پتھر پھیل کر پہاڑ ہو گئے ہیں۔ ہر شے بہت نفیس ہو گئی ہے۔ اگر ٹھوکر لگ گئی تو ٹوٹ جائے گی۔ سمجھ لو پیار کا نشہ اس سے بھی شدید ہوتا ہے۔ متلائے ہوئے ذہن کو چھوٹی سی، معمولی سی اور بے ضرری باتیں بہت بڑی باتیں لگتی ہیں۔ جذبات و احساسات کا بچ سے زیادہ نازک اور اس کے ٹوٹے ریزوں سے زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ جتنی شدید وابستگی ہوگی، اتنی ہی شدید غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اس لیے ہر قدم پر باہمی اعتماد کی فضا چاہیے۔ ورنہ اسی طرح رونا دھونا ہوا کرتا ہے۔ جب تم بھی مجھ سے پیار کی دعویدار ہو، تو اعتماد کی فضا تخلیق کرنا تمہاری بھی ذمہ داری ہے۔

ٹھیک کہتی ہو۔ میں بہت زیادہ پیار کرتا ہوں مگر انشاؤ، طلب بھی کرتا ہوں۔ اپنی اپنی طبیعت

اور رُحمان کی بات ہے۔ جو شخص چائے بھی خلوص سے پیتا ہو، کیا وہ پیار اور نفرت شدت سے نہ کرتا ہوگا؟ سچ جانو، تو مجھے اپنی نفرت سے بھی خوف آتا ہے اور اپنے پیار سے بھی۔ جیسی بہت کم لوگوں سے نفرت کرتا ہوں۔ پیار پر اب میرا زور نہیں اس کی شدت کا احساس تمہیں ہوگا؟

پیار کیا ہے؟ میں نے بہت سوچا۔ پیار کرنا، بیک وقت خدا ہونا بھی ہے اور پجاری ہونا بھی۔ خدا کی طرح پیار کی کائنات تخلیق کرنا اور پھر اپنی اس تخلیق کو سجدہ بھی کرنا۔ پیار کرنا دراصل پیار کروانا بھی ہوتا ہے اور جو دن وے چلتے ہیں صرف اپنائیت کے احساس کی پرستش کرتے ہیں۔ میں اور تم عام سے انسان ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں اپنے گرد و پیش سے اختلاف ہو مگر اس اختلاف سے ہمارا انسان ہونا، نہیں بدل سکتا۔ لوگ تمہیں ایک عام لڑکی کی شکل میں دیکھتے ہوں گے لیکن یہ میں ہوں، جس نے تمہیں دیوی بنا رکھا ہے اور یہ میں ہوں جو تمہیں پھر پوجتا بھی ہوں۔ تم نے بھی اسی طرح مجھے جانے کیا بنا رکھا ہوگا؟ یہی اپنائیت کا تخلیقی رشتہ ہے۔ اپنائیت کے انہی شدید بندھنوں میں انسان سمٹ کر قریب ہو جاتے ہیں اور رشتے پھیل کر وسیع۔

تمہاری اپروچ ذرا مختلف ہے۔ تم الفاظ کی بجائے بند آنکھوں، تیز دھڑکنوں اور اکٹھری سانسوں کی زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہو۔ پہلے پہل مجھے کچھ عجیب سا لگتا تھا کہ یہ لڑکی پہروں میرے ساتھ لیٹی رہتی ہے، اتنا پیار دیتی ہے کہ میرا خشک جسم تر ہو جاتا ہے، دنیا جہاں کی باتیں سنتی ہے مگر زبان سے کچھ نہیں بولتی۔ یاد ہے نا، میں نے ایک دن تم سے پوچھا بھی تھا اور تم جواب دینے کی بجائے مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔ اُس دن سے پوچھنا چھوڑ دیا..... مجھے تمہارا یہ جواب پسند آیا تھا۔

اُس دن تم نے روتے روتے کئی بار ہچکیوں کے درمیان کہا ”خرم کے ساتھ میں آج تک باہر نہیں گئی، ہم کار میں بیٹھ کر ہی ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی تھوڑے بہت ایک دوسرے کے قریب ہو لیے تو دوسری بات لیکن..... آپ کے ساتھ میں راتوں کو باہر رہی ہوں۔ جس قدر آپ میرے قریب ہیں، کوئی مرد کبھی میرے اتنے قریب نہیں آسکا۔ لیکن پھر بھی آپ ناراض ہیں۔ کیونکہ آپ مجھے چھوڑنا چاہتے ہیں۔“

جان جی! تمہیں بھلا کیسے بھلا سکتا ہوں؟ تمہیں چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟ جو ہوا اُسے بھلا

دو، فراموش کر دو۔ وعدہ رہا آئندہ کبھی نہ لڑوں گا۔ کبھی بھی..... مجھے افسوس ہے، تمہیں کتنی تکلیف پہنچی ہے!..... تمہیں روتے پا کر میں انتہائی اذیت ناک احساس کی آگ میں جل رہا ہوں..... خدا کے لیے رونادھونا اب بند بھی کر دو۔

آؤ کوئی اور بات کریں جو تپتی فردا کو شیریں امروڑ میں بدل دے۔ جو تمہارے لمس سے جاوداں ہو جائے۔ آؤ کہ لب و رخسار اور چشم و ابرو کی بات کریں۔ کوئی ایسی بات جو اندیشہ ہائے دور دراز کے کرب سے نجات دلا دے۔ کوئی ایسا ذکر، جو بے خود کر دے۔

کچھ یاد ہے، ۲۳ کی رات باہر رہنے کا پروگرام تھا؟ یہ پروگرام بہت پہلے کا ہے، لہذا اس لڑائی کی وجہ سے کینسل نہیں ہونا چاہیے۔ وہیں صفر کے ہاں چلیں گے۔ مسرت بھی وہیں ہوگی۔ تم نے چاہا تو 'اسالت' پر چلے چلیں گے۔ شہلا کہہ رہی تھی۔ اچھی فلم ہے۔ رات بھر تاش کھیلیں گے۔ اچھے اچھے گانے سنیں گے اور جی بھر کر گپ لگائیں گے۔

خرم کے فون کا فکر نہ کرنا۔ اُس کی کال کوئی نو بجے آیا کرتی ہے۔ اُس دن آٹھ بجے سے ہی فون خراب رہے گا۔ میں پہلے کی طرح یونیورسٹی کی کچھج والے آپریٹر کو کہہ دوں گا۔ تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو۔ صبح وغیرہ سے تربیلا والی سہیلی کے گھر رات رہنے کا بہانہ لگالینا۔ پہلے بھی تو اسی کا بہانہ بنا کر ہم باہر رہے لیے تھے اور کسی کو شک تک نہ گزرا تھا..... آگے تمہاری مرضی۔ ہم بہر حال حکم کے پابند ہیں۔

بھگی پکوں اور روتی آنکھوں کو بہت سا پیار
بہت ہی زیادہ

۲۳ دسمبر ۱۹۷۷ء

۱۲۹۔ سرسید ہال

دیوی جی

آج کی شام بھی کتنی ماتی تھی، سیاہ بادل کتنے اُداس اُداس تھے۔ اس گھٹن میں اتنے گہرے درد بکھرے تھے اور اتنے بوجھل غم کہ جن کا بوجھ اٹھا کر چلنا میرے بس میں نہ تھا۔ اگر خدا آسمانوں پر ہے تو یقین کرو، آج کی شام ہم ایسے لوگوں کے لیے سسکیاں لے رہا ہوں گا۔

یہ سارا بوجھ اٹھائے، میں کوئی سات بجے تک وحدت روڈ والے موٹر پر کھڑا رہا۔ تم نے چھ بجے آنا تھا مگر جانے آج شام ہی سے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہو، کوئی تکلیف دہ حادثہ۔

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی! ہم دُور سے پہچان لیتے ہیں

بے چاری شاہدہ گرتی پڑتی کوئی سات بجے پہنچی اور بتایا کہ خرم آ گیا ہے۔ تم نہ آسکو گی..... اور میں بمشکل اپنے آپ کو اٹھائے واپس ہاسٹل پہنچا۔ صفدر وغیرہ نے رات بھر الگ انتظار کیا ہوگا۔ تمہاری زیادتی ہے۔ تمہیں پتہ تھا اُس کے آنے کا امکان ہے تو بھلا بتا ہی دیا ہوتا۔ اِس بار تو میں نے سارا بندوبست تم ہی پر چھوڑا تھا۔ اب کس قدر بد مزگی ہوئی ہے اور پھر جب تک وہ شخص یہاں رہے گا ایک ہی جواب دو گی ”وہ دن میں تین بار چکر لگاتا ہے۔“ ٹھیک ہے وہ تین بار آتا ہے اور تین بار تمہاری قربت اسے میسر ہوتی ہے ورنہ میری جان چکر لگانے کی کیا بات ہے؟ ہم تمہارے آگے پیچھے دن میں کوئی سو بار پھرتے ہوں گے۔

تم پھر کہو گی، میں حقیقت سے گھبراتا ہوں۔ درست سہی آخر صرف تمہارا خرم کے پہلو میں بیٹھنا، کار کا فرائٹ بھرنا ہی تو تنہا حقیقت نہیں۔ یہ بھی تو حقیقت ہے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں اور

یہ بھی حقیقت ہے کہ تم تنہائیوں میں مجھ سے ملتی ہو۔ اُس بڑے آدمی کو کہونا، یہ حقیقت بھی تسلیم کرے، پھر پتہ چلے گا۔ ہم میں سے حقیقتوں کو کون زیادہ پہچانتا ہے؟ وہ پہلے ہی لمحے تمہیں کار سے اتار کر چل دے گا۔ کبھی خودکشی نہ کرے گا، مجھے بھی قتل نہ کرے گا۔ تمہیں بھی بھلا دے گا۔ یہ بڑے لوگ اس معاملے میں بزدلی کی حد تک فراخ دل ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اپنی خواہشوں سے پیار ہوتا ہے۔ کبھی میری یہ بات آزما دیکھنا، تمہیں پتہ چل جائے گا۔ ان لوگوں کی حقیقت میرے سگریٹ کے چھوڑے ہوئے کش سے بھی کم ہے۔

جن دو افسروں کے درمیان تم پھنسی پڑی ہو، اُن کی پہلی اور آخری خوبی افسری کے سوا اور کیا ہے؟ اِس سے ذرا ہٹ کر سوچو تو ایک اِس لیے منگیتا ہے کہ اتفاق سے تمہارے خاندان میں پیدا ہوا۔ دوسرا اِس لیے دل کے اندر ہے کہ وہ مجھ سے چند ماہ پہلے تم سے ملا تھا۔ یہ دونوں محض حادثے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ کیا مجھے اس بات پر سزا ملنی چاہیے کہ میں اتفاق سے تمہارے خاندان میں کیوں پیدا نہ ہو سکا؟ یا پھر تم سے پہلے کیوں نہ مل سکا؟ معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا؟ اگر خرم میری جگہ ہوتا تو شاید وہ بے چارہ یہ کچھ لکھ رہا ہوتا..... اور پھر یہ سارے حسین اتفاق افسروں ہی کے مقدر میں کیوں ہیں؟ اُن کے لیے ہر لمحہ اتفاق اور ہمارے لیے ہر اتفاق ایک سانحہ! میری سرکار یہ نہ تو تقدیر ہے اور نہ اتفاق ہے بلکہ ان دونوں کی جنم بھومی کا کرشمہ ہے۔ جسے لوگ لکشی کے حسین نام سے یاد کرتے ہیں..... کبھی تنہائی میں بیٹھ کر غور کرنا۔

میں گلہ نہیں کرتا، مجھے اِس ساری تکلیف دہ صورت کا احساس ہے، جس سے ہم دونوں گزر رہے ہیں۔ مستقبل کی طرف نظر کرو تو دُکھوں کی اُبلتی دلدل کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور حال ایک ایسا دکھتا لاؤ بن چکا ہے جہاں سے پیچھے مڑنا ناممکن، بٹھہرنا دشوار تر اور آگے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے کئی بار تمہاری اور اپنی زندگی کے حوالے سے اِس سارے قصے کے مختلف پہلوؤں کو جانچا ہوگا۔ مجھے تو یہ کوئی انوکھی سنواری دکھائی پڑتی ہے۔ جسے سلجھنا شاید میرے بس میں نہیں۔

تمہاری زندگی کے فسانے میں میجر صاحب کا رول ولن کا سا ہے۔ روایتی ولن جو اتفاق سے کزن بھی ہوا کرتا ہے۔ اِس امیر کزن کے ساتھ ہیروئین کا رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ ہیروئن اُس وقت آٹھویں نویں جماعت میں تھی۔ نا سمجھ اور بھولی بھالی سی۔ جوں جوں وہ جوان ہوتی ہے کسی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
 - ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
 - ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
 - ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
 - ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
 - ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
 - ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
 - ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
 - ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
 - ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
 - ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
 - ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
 - ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نا معلوم گھٹن کے احساس میں گھرتی چلی جاتی ہے۔ اپنے منگیترو کو وہ کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی۔ یونیورسٹی میں اُس کے پیچھے کئی لڑکے پڑتے ہیں اور ان میں سے ایک جو کسی باہر کے ملک سے آیا ہے اُس کے خاصے قریب آ جاتا ہے۔ مگر اسی دوران ایک دوسرا امیر زادہ فلمی ہیرو کی طرح نمودار ہوتا ہے۔ ایک شام ہیرو، اُسے فون کرتا ہے اور انتہائی دکھ بھرے انداز میں اُس کی منگنی والی خبر کی تصدیق چاہتا ہے اور پھر دوسری صبح سے وہ شیو بڑھائے، بال بکھرائے اور منہ پھلائے روایتی ہیرو کی طرح کار کے ریکارڈ پلیئر پر غم کی موسیقی بجاتا ہوا، ہیروئن کے طواف لینا شروع کر دیتا ہے۔ ہیروئن بھی اُس کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور آخر ایک رات فیصلہ کر لیتی ہے کہ جب تک وہ یونیورسٹی میں ہے، ہیرو سے ربط اُلفت بڑھانے میں کوئی حرج نہیں۔ شادی کو ابھی دو سال پڑے ہیں اور یوں بھی منگیترو کا خاص پسند بھی نہیں کرتی۔ سلسلہ چل نکلتا ہے جو بعد میں سنجیدگی اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک تو سنواری بہت واضح ہے کہ ایک افسر کی بیٹی ایک افسر کو پسند کر رہی ہے اور دوسرے افسر سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔ گھر والے تھوڑا بہت شور مچا کر مان ہی جائیں گے اور اختتام میں ہیرو، ہیروئن کی شادی پر ڈراپ سین ہو جائے گا۔ خرم اس افسانے کا روایتی ہیرو ہے۔

لیکن اسی دوران ہیروئن، یونیورسٹی کی سیاست میں دلچسپی لیتی ہے۔ ایک غریب مگر خاصا عجیب و غریب سالاکا جو اپنے حلیے سے عیسیٰ لگتا ہے، ہیروئن کو پسند کرنے لگتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد ہیروئن بھی اُس کی جانب کھینچ جاتی ہے۔ دونوں ملنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تیسرا آدمی اگرچہ خاصا کرخت ہے، مگر بہت خلوص سے زندہ رہ رہا ہے۔ اُسے بہت سے لوگ جانتے ہیں اور شاید درس گاہ کا کوئی حصہ ایسا نہ ہوگا جہاں کھڑے ہو کر اُس نے اپنے مخصوص انداز میں تقریریں نہ کی ہوں گی۔ ہیروئن اُس کے ساتھ رہنا شروع کر دیتی ہے۔ اُس کی باتوں کو بھی پسند کرنے لگتی ہے۔ ہیروئن حیران بھی ہوتی ہے کہ لوگ اس آدمی کو شیطان سمجھتے ہیں یا پھر رحمان۔ کوئی اسے قتل کرنے کے درپے تو کوئی اس کے لیے مرنے کو تیار۔

مگر یہ آدمی ہیرو ہے نہ ولن، بلکہ کسی تیسرے مقام پر کھڑا ہے۔ اُس کا کوئی مستقبل نہیں، کوئی کار، کوئی دولت، کوئی اور چیز اُس کے پاس نہیں۔ وہ ایسا زادی ہے جو پہلے سے موجود مثال کے کسی کونے پر پورا نہیں اُترتا۔ وہ جس مقام پر کھڑا ہے، وہاں سے چیزیں بہت مختلف نظر آتی ہیں۔ اُس

کیم جنوری ۲۰۱۹ء
۱۲۹۔ سرسید ہال

لڑکی

آج سو موار تھا۔ بقول تمھارے نیا سال، نیا دن اور نئی تاریخ۔ ہم نے بھی نئے سال کی ابتدا کے نو کے سگریٹ، بے ذائقہ چائے اور چھاتی میں ہلکے ہلکے درد کے احساس سے کی۔ کینے پہنچا تو سبھی لڑکیاں موجود تھیں۔ تم لوگوں نے نئے سال کی خوشی میں انگریزی گیت گائے۔ بیٹیاں، بھائیاں اور اپنا یہ جنگلی ترانہ بار بار عوام کو سنایا

پڑے ہیں ہم اکیلے۔ کوئی ہانپوں میں ہم کو لے لے

تمھاری ساری سپاہ نے تقریباً بارہ بجے سائیکلو جی ڈی پارکمنٹ میں پڑاؤ ڈالا اور کوئی شور مچایا، آف پناہ! میں اُس وقت منظور اعجاز کے ساتھ اپنے شیعے کے لان میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے معنی خیز انداز میں ہنسنے ہوئے پوچھا ”تمھاری فریڈیاں، آج بڑی خوش خوش لگ رہی ہیں۔“ میں نے بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ بات گول کر دی۔

اُس وقت شاید ایک بجا ہوگا۔ جب میں تم سے ملا۔ ابھی ہم بات کر رہے تھے کہ ڈور سے خرم کی کار آتی دکھائی دی اور اُس شخص کو دیکھو سو گز پر ہی کار روک کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے میں اُسے کھا جاؤں گا۔ میرا دل تھا آج اُسے چند منٹ وہیں کھڑا رکھوں۔ مگر تمھاری حالت دیکھ کر مجھے ترس آ ہی گیا۔ مجھے یوں لگا اگر بیک وقت ہم دونوں تمھارے سامنے آ گئے تو تم پاگل ہو جاؤ گی۔ تم خدا حافظ کہہ کر تین بار اُس کی جانب چلیں اور پھر پلٹ آئیں۔ جانے تم کیا کہنا چاہتی تھیں مگر ہر بار کہہ نہ پائیں۔ میں نے سوچا، جتنی دیر میں وہاں رہوں گا، خواہ خواہ تمھیں ڈپٹی پریشانی ہوگی۔ میں نے کہا ”تم اب جاؤ“ اور خود وہاں سے لوٹ آیا۔

پھر کوئی دو بجے تم ساری سہیلیاں، خشک نہر کی ریت پر چلتے چلتے واپس ہاسٹل میں پہنچیں۔

پھر ہاسٹل کی پچھلی جانب فیم اور اُس کی منگیتر کے ساتھ میر ہوتی رہی۔ کوئی ڈھائی بجے کے قریب بخاری والے ہاسٹل میں جانا ہوا۔ تین بجے مہجین اور طلعت کے ساتھ نہروالی سڑک پر ٹھہلنا ہوا۔ دوبارہ ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے قہقہے پھوٹے رہے۔ خرم تو کہیں جا کر شام کو آیا اور تم اپنے پورے بریگیڈ سیٹ کار میں دھنسن گئیں۔ کار حسب معمول ہمیں دھول کرتی ہوئی لبرٹی مارکیٹ کی جانب سرک گئی۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے واپسی ہوئی۔ صرف ایک بات قابل ذکر تھی کہ تم جاتے وقت پچھلی سیٹ پر بائیں جانب بیٹھی تھیں، مگر واپسی پر تم اپنی اصل جگہ پر تھیں۔

کچھ سنا تم نے؟ اس دنیا میں ہم سے حقیر لوگ بھی بستے ہیں۔ جن کی زندگی نشان پا گنتے سکتے بیت جاتی ہے۔ میں نہیں کہتا یہ سارا وقت میرے نام کر دو۔ لیکن کوئی لمحہ ایک سانس جتنا طویل ہی سہی، اُس شخص کو بھی ملنا چاہیے، جس کے پاس تمہارے لحاظ کی سب سے زیادہ قدر ہے۔ چلو خرم سے تمہارا ملنا، مجبوری تھی۔ مگر دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنا وقت کیوں قتل کرتی رہتی ہو۔ صبیحہ، غزالہ، یانہ جبین اپنے اپنے مقام پر کبھی لوگ اچھے ہیں مگر تمہارے قدم تو نہیں چومتے، مجھ جتنا پیار تو نہیں کرتے..... عورت اکبھی تو، کچھ تو اپنے دماغ سے بھی سوچ لیا کرو۔

کبھی کہتے ہیں آج نیا سال تھا۔ مگر مجھے تو اس کی ابتدا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ انسان بھی کتنا کوتاہ فہم ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص دن یا وقت کے کسی خاص نکتے پر نیا سال شروع ہوتا ہے۔ پھر وہ اس کی خوشی منانے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ زمانہ تو اُس کے بنائے ہوئے مہو سال کی قید سے آزاد ایک طوفانِ بلا ہے اور ہم تم اس بہاؤ میں دو قطرہ کی مانند صرف چند لمحوں کے لیے باہم ٹکرائے ہیں۔ ہم نے پھر سے فطرت کے اسی طوفان میں کھو جانا ہے۔ اندھے راستوں پر، انتہائی منزلوں کی جانب، اُن دیکھی دنیاؤں میں جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔ دہرائنا اور لوٹنا فطرت کی عادت نہیں۔

زندگی کے اس پہلے سفر کی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا۔ ایک لمحہ دوسرے لمحے کے اندر موجود ہوتا ہے، جو ہر لمحہ نئے سے نیا ہے۔ چلو خیر! اپنی نا کبھی کی بنا پر ہی اگر کوئی اسے نئے سال کا آغاز جان کر خوش ہو لے تو اسے بھی غنیمت جانا چاہیے۔

اگر تم بھند ہو کہ آج واقعی نیا سال ہے تو یقین جانو، یہ نئے ڈکھوں کا سال ہے۔ پرانے

ڈکھوں کی کوکھ سے جنم لینے والے نئے ڈکھوں کی ابتدا کا پیغام تمہارے اسی نئے سال کے کسی حصے میں ہم دونوں نے یونیورسٹی کو خیر باد کہنا ہے۔ اسی نئے سال نے تمہیں مجھ سے جھین لینا ہے۔ پھر شاید کوئی ایسا نیا سال نہ آئے، جس کے پہلے دن تم مجھ سے چند قدم دور بیٹھی، خوشی کے گیت گاؤ۔ پھر شاید ایسی حسین صبح میرے مقدر میں نہ ہو، جس کی آمد پر تمہارے مسکراتے ہونٹوں سے 'نیا سال مبارک' سنوں۔ بہت ممکن ہے کوئی نیا سال تمہیں تو خوشی کے گیت گاتے رہنے کے قابل کر دے، مگر میں اُس لمحے تمہاری آواز کے رس سے جانے کتنے دور زندگی کے بوجھ تلے سسک رہا ہوں گا۔ تم ہی بتاؤ، یہ وقت، یہ عمر، فراغت کے یہ لمحے، یہ بیٹھے بیٹھے درد، یہ سب کچھ بھلا کہاں ہوگا؟

مجھے تمہارے اس نئے سال کی حقیقت کا احساس بھی ہے اور آنے والے سیاہ لمحات کی پرچائیں بھی دیکھ رہا ہوں۔ جہی میں اُداس اُداس تھا۔ تم نے 'نیا سال مبارک' کہا تو میں ہشکل تمام مسکرایا تھا۔

کل شام تمہیں ایک نظر دیکھنے ہاسٹل کی جانب گیا۔ خوشیوں کے بادل تمہارے ارد گرد برس رہے تھے اور تم سازشی کا پلو واکیے قہقہے سیٹھنے میں مصروف تھیں۔ تمہارے ارد گرد 'حوروں' کا جھکھکا تھا۔ ساتھ کچھ 'فرشتے' بھی تھے۔ میں نے اپنی حسرتوں کی جہنم میں کھڑے ہو کر تمہاری ہنسی ہنسی کا نکات کو دیکھا۔ پھر دُور ہی سے لوٹ گیا کہ تمہارے بہشت پر مجھ گناہ گار کا سایہ نہ پڑے۔ میں تو جنت سے نکالا ہوا انسان ہوں، دُرتا ہوں کہ تمہارے 'رضوان' نے مجھے جہنمی کو دیکھ لیا تو اسے تکلیف ہوگی۔

لو آج کی تازہ خبر سنو! تمہارے 'سٹٹ مین' نے ایک بہت حسین لڑکی کو رام کر لیا ہے۔ یقین کرو، بہت ہی خوبصورت شے پر شب خون مارا ہے۔ فائن آرٹس کی کوئی نایاب تصویر ہے۔ سنا ہے کئی گیلریوں میں اس کی پہلے بھی کامیاب 'نمائش' ہو چکی ہے۔ دیکھو تا اُس غریب کی بھی خدا نے من ہی لی۔ تمہارے پیچھے پھر پھر کر خوار ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ خبر نیکی خان کے اقتدار چھوڑنے سے زیادہ اہم ہے اور اسے 'قومی خبر تائے' میں نشر کیا جانا چاہیے۔ جرنلزم والی 'چے گویرن' آج ملی تھی۔ کہہ رہی تھی تم سے بھی ملنے جائے گی۔ پھر آئی تھی کیا؟ بڑی اچھی لڑکی ہے۔

ہاں بچ، دن کے وقت میرے ساتھ جو سارٹ سائز کا تھا، میرا دوست تقسیم ہے۔ اس وقت میرے ساتھ ہی کمرے میں لیٹا ہے۔ لندن میں تھا تو میں نے اُسے تمہارے متعلق بتایا تھا۔ اُسے بہت شوق تھا، ویسے اس نے تمہیں پسند کیا ہے۔ (اس شخص کا اس میں کیا کمال تم ہو ہی اس قابل)۔ اُسے دیکھو بی ایچ ڈی کر کے یہاں بھاگ آیا ہے۔ خیر جلد ہی راہِ راست پر آ جائے گا۔ تم سے ملواؤں گا۔ بڑا پیارا آدمی ہے۔

اب تو ہونٹ بھی جل اُٹھے ہیں.....

..... پیار.....

۱۵ جنوری ۲۰۱۹ء

۱۲۹- سرسید ہال

کنول

شاہدہ بھی کیا ساہو لوح ہے۔ ذرا سی بات تھی اُس نے مجھے دوڑا دوڑا کر تقریباً شہید کر دیا۔ ہم تینوں تمھارے ڈیپارٹمنٹ کی میز میوں پر بیٹھے تھے تو وہ کس قدر پریشان تھی، حالانکہ پریشان تھیں ہونا چاہیے تھا۔ ویسے میں نے سارا پتہ کرا لیا ہے۔ کوئی وارنٹ وغیرہ نہیں۔ کوئی ایسی بات ہی نہیں۔ یوں بھی ہم نے کون سا ہنگامہ کیا ہے؟ آخر پولیس کس خوشی میں ہمیں گرفتار کرے گی؟ محض انواہ تھی اور تم جانتی ہو اپنی قوم اس معاملے میں خاصی حد تک خود کفیل واقع ہوئی ہے۔ فکر مند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ پولیس نے اپنے معمول کے مطابق تمھارا ایڈریس لیا ہے۔

دراصل پولیس والے اپنے پرانے غم گسار ہیں۔ غریب بڑا ہی دھیان رکھتے ہیں۔ جہاں پہنچوں، اُن کا کوئی نہ کوئی آدمی میرے استقبال کے لیے ضرور موجود ہوتا ہے۔ بے چارے میرے ملنے جلنے والوں کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ انتہائی خلوص سے اُن کا ناک نشہ اور اتا پتا نوٹ کرتے ہیں۔ اس ذرہ نوازی کے لیے میں جنرل ایوب خان کا بہت احسان مند ہوں۔ اُسی کے حکم سے یہ اہتمام ہوا تھا۔ ورنہ کہاں میں نادار اور کہاں یہ شاہانہ سلوک؟ ایوب خان تاریخ کی شکست و ریخت کا شکار ہو گیا، مگر پیار کی زنجیر کا یہ سلسلہ ابھی تک نہیں ٹوٹا۔ پچھلے تین چار ماہ سے تم اکثر و بیشتر میرے ساتھ نظر آتی رہیں۔ پولیس والے جان گئے کہ یہ ’مہمانِ دل‘ کے اندر چلا گیا ہے۔ لہذا تمھاری دیکھ بھال کے لیے اُنھوں نے تمھاری فائل بھی کھول دی ہوگی۔ ڈیپارٹمنٹ سے انہوں نے تمھارا ایڈریس مانگا۔ یقیناً میرا ذکر بھی چلا ہوگا۔ کلرک سمجھا، شاید ہم دونوں کو پولیس گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اُس شریف آدمی نے کسی سے بات کی ہوگی۔ بس پھر کیا تھا..... جنگل میں آگ پھیل گئی۔ یونیورسٹی کے خشک جنگل میں انواہوں کی آگ۔ یوں بھی بہت جیزی سے پھیلا کرتی ہے ا

پولیس والوں سے میں بہت بھگ رہا کرتا تھا۔ ادھر اُن کا ذکر چھڑا، ادھر ذہن نے ابکا کی لی۔ میرا خیال تھا، بہت ہی بے ذوق اور خشک قسم کے لوگ ہوتے ہوں گے۔ ان کے نزدیک انسان زیادہ سے زیادہ چور ہو سکتا ہے، ڈاکو یا پھر سیاست دان..... کہ پوری زندگی بے چارے انہی کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔ ان کی دنیا، خشک سیاسی تقریروں، پولیس مقابلوں، لاشی چارج اور آنسو گیس کے دھوئیں سے عبارت ہے۔ دل کی دھڑکنوں سے بکھرتی آرزوئیں اور اُن سے پھونٹے معافی بھلاؤ کیا جائیں؟ مگر اب کے انہوں نے میرے سارے شکوے دُور کر دیئے۔ کیا رومانی پیش گوئی کی ہے۔ میری کوئی مانے تو انہیں صرف رومانی رپورٹیں لکھنے پر لگا دیتا چاہیے۔ ہمارے ادب کے بے معنی افسانوں سے اُن کی رپورٹیں لاکھ درجے بہتر ہوں گی۔ کم از کم ہمارے معاملے میں تو انہوں نے یہی ثابت کیا ہے۔ یہ اُن کی ساری زندگی کا واحد ٹیک کام ہے، جس کے سہارے شاید بچنے جائیں۔

حیرت ہے! تمہارے اتنے بڑے افسر نے اُس دن صرف اتنی ہی بات پر بُرا منا لیا! اُس خوش نصیب کو تو صرف چند لمحے تمہارا انتظار کرنا پڑا۔ اُسے زندگی میں پہلی بار تم سے سوگزر پرے ڈکنا پڑا۔ مگر برداشت نہ کر پایا اور فوراً ہی چلا اُٹھا۔ ”میں تمہارا نوکر نہیں۔“ پھر ناراض ہو کر اُسی وقت چل بھی دیا۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم کو تھوڑی دیر اور نہ جانے دوں، لیکن تمہارے خرم کو تکلیف نہ دے سکا۔ اور اُسے دیکھو.....

ہم مرد، عورت کے معاملے میں بڑے یہودی واقع ہوئے ہیں۔ عورت کو سکوں کی مانند جموری میں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ سکے اپنی مرضی سے گردش کرنا چاہیں تو بھلا ہم کہاں خوش ہوں گے؟ تم ہر وقت اُس کے سامنے میری تقریض کرتی رہتی ہو، اس نے بُرا تو منانا ہی تھا۔ کوئی کب برداشت کرتا ہے کہ کتنے اپنے آقا کے سامنے کسی دوسرے مرد کے لیے لڑتی پھرے؟ اس طرح مردانگی اور برتری کے احساس کو بہت ٹھیس پہنچتی ہے۔ انسان بن کر سانس لینا بہت دشوار کام ہے، میری سرکار ایسے اُس کا دیا ہوا، نیکل! مجھے پسند آیا۔ ”ژوہانی“ غیبر! کیا خوبصورت تشبیہ دی ہے۔ آدمی مقامِ معرفت سے کچھ کچھ آشنا لگتا ہے۔

پچھلے دو ہفتوں کا ”کوٹہاتی“ ہے۔ دو رات والا پروگرام بھی بچ ہی میں لنگ گیا تھا۔ اب فوراً

بن جانا چاہیے۔ یوں تو ہم دن میں کئی بار ملتے ہیں لیکن کیا فائدہ؟ دوسروں کے سامنے انہی بننا پڑتا ہے۔ تم مجھے دنیا کے سامنے اپنا کہنے کی اجازت دو، میں تمہیں باہر چلنے کو نہیں کہوں گا۔

امتحانوں کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی نسل یونیورسٹی چھوڑتی نظر نہیں آتی۔ مایوسیوں میں گھرے لوگ ہیں۔ یونیورسٹی سے باہر کہاں جائیں؟ جس حساب سے مطالبے داغ رہے ہیں، اُمید ہے امتحان ملتوی ہو جائیں گے۔

تم بھی بہت عجیب ہو، پہلے بھی بتایا ناز ہمارے خلاف افواہیں عام کرتی رہتی ہے لیکن اُسے ہر وقت ساتھ چپکائے پھرتی ہو۔

دیکھو، خرم کے سامنے میری تعریف نہ کیا کرو۔ اُسے اور شک ہو جائے گا۔ وہ کوئی طور کرے، تو اُس سے لڑو بھڑو گی۔ وہ شریف آدمی تو یہاں سے کراچی جا بیٹھے گا اور تمہارے آنسو مجھے ہی خشک کرنا پڑیں گے۔ اب تو مجھے تمہارا روحانی پیغمبر کہتا ہے پھرنا چاہئے کیا کہے گا؟

میری جان! دکھ پہلے ہی کیا کم ہیں کد ان میں اور اضافہ کریں۔ اب تو کوئی سکھ چین کی بات کرو۔ پیار کی بات۔

۱۶ جنوری ۱۹۷۳ء
ککرسیداں (درکالی شیرشاہی)

رانی

آج عید ہے، میں اپنے گاؤں سے باہر ایک ٹیلے پر بیٹھا، تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میرے قریب میلو بیٹھا ہے، میرا بھتیجا..... بڑا ہی سارٹ اور پیارا بچہ ہے۔ ذرا دیکھو تو، کتنے اٹھاک اور معصومیت کے ساتھ مجھے لگتے ہوئے دیکھ رہا ہے، جیسے میرے درد کو محسوس کر رہا ہو۔ اس کی گہری سیاد آنکھوں کے پیچھے خاموشی کا سمندر موجزن ہے.....

اس لمحے دن کا کوئی ایک بجا ہوگا۔ موسم انتہائی حسین ہو رہا ہے۔ کھلی فضاؤں کی آغوش میں ہلکے ہلکے بادل جوان آنکھوں کی طرح چل رہے ہیں۔ دھرتی کے سینے پر سرسراتے کھیت..... دل کی تھن آرزوؤں کی مانند بے چین ہیں۔ خشک ہوائیں، نہایا دھویا اُجلا اُجلا سامانِ حول گاؤں کے صحن وسط میں 'پینگ' کے ارد گرد جمع ہونے والوں کے قہقہے، ہر جانب سادگی کی برسات..... صرف تمہاری کمی ہے۔

لوا آج ہم نے بھی نماز پڑھی، لوگ تھے کہ جہدے پر جہدہ کیے جاتے تھے۔ ہم نے ذرا گردن جھکائی اور تمہیں اپنے اندر سکراتے پایا۔ لوگ الفاظ کے سحر میں کھوئے اٹھتے بیٹھتے رہے، ہم نے ہر سانس کے ساتھ تمہارا نام لیا۔ بالآخر لوگ تھک ہار کر بیٹھ گئے اور اپنی اس مشقت کا معاوضہ چاہا۔ مانتے کے لیے ہاتھ پھیلے۔ زندگی کی ہر ضرورت کے لیے لب بلبے..... گویا خدا نے ہوا کوئی سا ہوکار ہوا، جس کے پاس ابھی کھانا کھلا ہے۔ اس جہاں میں قرض دیئے جاتا ہے، کسی اور دنیا میں بمعہ سود وصول کر لے گا۔ میں سوچ رہا تھا یہ بھی کیا لوگ ہیں..... اُن دیکھے خدا کو پوجتے ہیں، مگر اُس سے اتنا پیار بھی نہیں کرتے، جتنا تم سے میں کرتا ہوں..... سچ جانو، مجھے تو یقین ہے، یہ سارے لوگ خدا پر یقین نہیں رکھتے، صرف اپنے آپ کو قریب دیتے ہیں، ورنہ اُن کی ایسی حالت تو ہونی چاہیے، جیسے

میری ہے..... انسان کا بھی جواب نہیں۔ اپنی آرزوؤں کا ایک بہت بڑا بت بنا رہا ہے، کبھی اسے پوچھا ہے اور کبھی توڑتا ہے..... حسرتوں کی اسی دلدل پر چلتے چلتے..... بالآخر ختم ہو جاتا ہے..... مگر خود فریبی سے باز نہیں آتا۔ مولوی صاحب نے خطبہ دیا اور اپنے عاشق خدا ہونے کے بہت دعوے کیے۔ حضرت کا وزن تین من سے اوپر ہی ہوگا..... بھلا عاشقوں پر اتنی چربی ہوا کرتی ہے.....؟

..... نماز کے بعد یا ران کھن سے قصہ۔ ہائے غم کا ذکر چلا، بھولی بسری یادوں کے سمندر میں بیٹے لمحات کی خوابیدہ لہریں ابھریں، گئے زمانوں کے جکے جکے سائے، گہرے ہوئے اور ہم سب دوست کافی دیر تک ماضی کے سراپ میں بھٹکتے پھرے۔ گزرے دنوں کی تلخ باتوں کا ذکر بھی آج شیریں تھا..... انسان بھی کتنا ماضی پرست ہے۔ حال کے تلخ حقائق سے خوف زدہ، مستقبل کے سیاہ اندھیروں سے مایوس، ماضی کی تہوں میں سر چھپاتے چھپاتے، ایک دن خود ماضی بن جاتا ہے۔

ہمارے گاؤں میں..... ایک بوڑھا درخت سر جھکائے کھڑا ہے۔ جوان لڑکیاں اور لڑکے اسی کے تنے پر خوشیوں کا جھولا ڈالتے ہیں اور پھر اسے دل میں چھپی خواہشات کی طرح، اونچے سے اونچا لے جانے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بوڑھے، بچے اور عورتیں ایک جانب بیٹھے اس منظر سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اکثر ذکر چلتا ہے کہ فلاں کی ثانی یا دادا نے بوڑھے درخت کی ان ٹہنیوں کو پاؤں لگائے تھے۔ یہ دن جوان لوگوں کا دن ہے..... چنانچہ مزہ بدلنے کے لیے کبھی بکھاروہ اپنی ماؤں باپوں یا اس عمر کے بوڑھے لوگوں کو گھسیٹ کر پیٹنگ میں لا بٹھاتے ہیں۔ ہر جانب سے قہقہے پھوٹتے ہیں۔ فخرے اچھالے جاتے ہیں..... اور جلد ہی پیٹنگ پر بیٹھا شخص ہانپ کر نیچے اتر آتا ہے۔ میں کبھی، پیٹنگ کا بہت رسیا ہوا کرتا تھا۔ مگر جوں ہی فضا میں بلند ہوتا، ذہن میں کھسک پھر شروع ہو جاتی بار بار ایک ہی خیال آتا "اتنی بلندی سے گر گیا تو پھر کیا ہوگا....." اور نیچے اتر آتا۔ بلندی سے میں کبھی خائف نہ تھا۔ البتہ بلندی سے گرنے کا خوف مجھے ہمیشہ رہا۔ آج بھی ہے۔ مگر جھولا ڈالنے کا سارا اہتمام، پھر اس کے نیچے طوفان بدتمیزی برپا کرنا، ہر کسی کو 'ٹوٹ' کرنا یہ سارے کام میرے ذمہ ہوا کرتے تھے۔ جب میری باری آتی تو سبھی لوگ مجھے انتہائی خلوص سے 'ٹوٹ' کرتے۔ اب کی بار پہلی دفعہ میں جھولے کی جانب نہ گیا۔ چھوٹے موٹے بھی گھر پہنچ گئے۔

بھیری منت سماجت کی مگر وہاں منتا کون؟ مجھے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ جانتی ہو یہ لوگ مجھ سے ذرا

بھی امپیرس نہیں۔ ان کے لیے میں ابھی تک گاؤں کا وہی کھلنڈ راجپہ ہوں۔ میری بے طرح بڑھی شیوا اور طویل زلفیں دیکھ..... مجھے یہ سبھی 'سائیں' سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے عشق میں ناکامی کے بعد میں 'مجلا' سا ہوا پھرتا ہوں۔ اوپر سے بہت بڑھ گیا ہے، جیسی یہ حالت ہوگئی ہے۔

'پینگ' کے ارد گرد ایک دنیا جی تھی۔ میں نے رسم پوری کی..... اور جلد ہی نیچے اُتر آیا۔ قریب پڑی ایک چار پائی پر بیٹھی بوڑھی عورتیں ذرا سی نکٹیں اور میں اُن کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اسنے میں میری بچتی شاہدہ ایک چھوٹے سے گول منول بچے کو اٹھائے میرے پاس لے آئی۔ ان چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو تو جیسے دوسروں کے بچے اٹھائے اٹھائے پھرنے کا خطہ ہوتا ہے۔ میں نے ہاتھ پھیلائے تو بچہ ہلک کر میرے پاس آ گیا۔ قہقہوں کا ایک طوفان سا پھٹ پڑا۔ حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے؟ پاس بیٹھی ایک عورت نے پوچھا "بچہ اچھا لگتا ہے حسیں؟" میں نے کہا "کافی اچھا ہے۔" اس پر پھر ایک قہقہہ لگا۔ دُور کرنے میں بیٹھی ارشاد ہمیشہ سے کچھ زیادہ شرمائے مسکراتی تھی۔ ہماری نظریں ملیں اور اُس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کسی نے کہا "لوگوں نے تو گھر سالیے۔ اب تو بھی شادی کر ہی لے۔" مجھے بعد میں پتہ چلا یہ سب پلاننگ تھی۔ مجھے وہاں لایا ہی اس لیے کیا تھا کہ ارشاد سسرال سے آئی ہوئی تھی اور یہ بچہ اُسی کا تھا۔ بچے بوڑھے سبھی جانتے تھے کہ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو چاہا تھا۔ چنانچہ کبھی نے مل کر یہ مذاق کیا تھا۔

جانتی ہو، جس ٹیلے پر میں بیٹھا ہوں، یہاں میری کتنی یادیں بکھری پڑی ہیں، جیسے کل ہی کی تو بات ہو۔ میں یہاں اپنے بچپن کے ساتھیوں کے ساتھ گلی ڈنڈا اٹھایا کرتا تھا۔ اتوار کے دن سکول سے چھٹی ہوتی تو ہم مونشی چرائے ادھر آتے، اسی ٹیلے پر بیٹھ کر ہمارے گاؤں کا ایک بوڑھا انتہائی بڑسوز آواز میں سیف السلوک گایا کرتا تھا۔ بے چارہ اب تو خاک ہو چکا۔ میرے ذہن میں اُس کی آواز کا درس آج بھی موجود ہے۔ وہ اکثر یہ بند گایا کرتا تھا۔

سدا نہ تھیں مہندی لکسی، سدا نہ جھکن دنکاں
سدا آواراں نال قطاراں، رہیاں کدوں کھنکاں
سدا نہ چھوپے پا عمر، تل بل بہناں سنگاں

وہ بچپن کا انمول زمانہ تھا۔ اِن الفاظ کے معنی سے کوئی آشنائی نہ تھی۔ ذہن کی دنیا، گاؤں

کے ان سیدھے سادھے راستوں تک محدود تھی۔ اب محسوس ہو رہا ہے کہ واقعی خوشیوں کے لمحات، دوستوں کا ساتھ، طوفانِ محبت، ہلکے ہلکے جذبات، یہ عمر، یہ زندگی اتنی تیزی سے گزر جاتی ہے، جتنی تیزی سے تمھاری قربت کے لمحات، دیکھو تو..... یہ وہی جگہ ہے، وہی مٹی، وہی ماحول، مگر میں ویسا نہیں۔ میرے ذہن پر سوچوں کا بوجھ ہے۔ غم زدہ، مایوس اور پریشان ہوں۔ پہلو میں ایسا دور لیے بھرتا ہوں، جس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا۔ نہ دوست، نہ ماں باپ، نہ کوئی اور..... وہ زمانہ کتنا اچھا تھا، ان ہی کھیتوں میں تھلیوں کے پیچھے بھاگ کر خوش ہو لیتا تھا۔ کاش میں تمھاری درس گاہوں میں نہ پہنچتا۔ جہاں میں نے اپنی سادگی کھودی ہے۔ مجھ سے میں ہی چھڑ گیا ہوں۔ اس کے بدلے مجھے کیا ملا؟ تم ایسے آشنا، ڈکھ کی باتیں، غم کے فسانے، درد کے سانس، بحرِ میاں، نا کامیاں..... جہاں قدم قدم پر مجھے اپنی بے مائیگی کا احساس ہوا۔ جہاں ہر طرف سنگ مرمر سے تراشے بت لے۔ جن کی آنکھیں چاندی اور دل سونے کے تھے۔ مگر ان کے شفاف چہروں پر موت کی سی بے حسی تھی۔ میں گوشت پوست کا انسان، ان پتھروں سے گرا کر کرم بن ہو گیا۔ میرا جسم جل اٹھا، دل پھوٹ بھا..... اور میں ریزہ ریزہ ہو کر نکھر گیا۔ میرے زخمی احساس سے خون کے فوارے ابل رہے ہیں۔ مگر نبض کی اس دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا، جو خون کی اس گنگا کو دیکھ ہی لیتا۔ !!!

ہاں مگر دیکھ لو ذرا ہمارے حوصلے بھی، حمیں کہاں کہاں یاد کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ تمھاری بات جانے کس مقدور والے کے گھر اترے گی..... مگر تمھاری یادوں کی بات تو اس وقت سامنے ہے۔ میں اس کے جہوم میں تنہا بیٹھا..... کیا کیا سوچ رہا ہوں، اپنا دل بھی ایک دیوانہ ہے۔ جانتا ہے تم وہ شہنم ہو، جس نے صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اُڑ جانا ہے۔ سمجھتا ہے کل کتنا خوفناک ہوگا۔ پھر بھی تمھارے لیے جئے جاتا ہے۔

اب کی بار ایک بات نہی بھی ہوئی..... میری ماں مجھ سے ناراض ہو گئی۔ کتنی سادہ ہے، کبھی تھی استخوانوں کے بعد وہ خوشی دیکھنا چاہتی ہے۔ مگر میرے پاس خوشی ایسی چیز کہاں ہے، جو اُسے دوں۔ میں تو اپنا سب کچھ تمھارے حوالے کر چکا ہوں۔ تم دونوں اپنے اپنے مقام پر اتنی سخت کیوں ہو؟ جانے کیوں رُوندھ جاتی ہو؟ ایک خوشیاں مانگ رہی ہے..... دوسری چھین رہی ہے۔ تم ہی بتاؤ۔

میں کیا کروں؟ تم دونوں میں سے..... کسے چھوڑوں؟ اور کیسے؟..... اور چھوڑ کر پھر زندہ کس طرح رہوں؟ تم ہو کہ اپنا گھر بسانا چاہتی ہو، وہ ہے کہ اپنے بیٹے کا گھر بسانا چاہتی ہے۔ مگر کاش تم دونوں ایک ہی طرح سوچتیں۔

تمہارے لیے ایک سوٹ لیا ہے۔ اچھا رنگ ہے۔ مجھے رنگوں کے نام نہیں آتے..... شاید پنک ہے۔ مردانہ قمیض بنانا بہت سچے گی۔ دیکھوں میچو بہت بور ہو رہا ہے، بار بار گھر چلنے کا اصرار کر رہا ہے..... اجازت دو۔

بہت سہاویہ

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

۱۳۰ جنوری ۱۹۷۳ء
کلسیداں (درکالی شیر شاہی)

دیوی جی

خط ملا، واقعی زلف یار کی طرح دراز تھا۔ ہاں مگر اُس کی طرح بل کھایا ہوا نہ تھا، بالکل سیدھا سا داسا تھا۔ تم نے کہا تھا تم جذباتی خط نہیں لکھ سکتیں..... خرم کو بھی ایسے ہی خط لکھتی ہو، سو جناب نے اس خط میں اپنی یہ بات پوری طرح بھائی ہے..... ویسے اچھا ہے، بل کھانا یوں بھی اس بات کی نشانی ہوا کرتا ہے کہ کوئی سیدھا کروے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے آدمی پہلے ہی سیدھا رہے، ورنہ ہماری حالت دیکھ لیجئے۔ کالج کے اُن گنت کٹروں کی طرح قرش پر بکھرے پڑے ہیں۔ جلی راکھ کی مانند فضا میں اُڑ رہے ہیں۔ آپ ایسے سمجھ دار لوگوں کو عبرت پکڑنی چاہیے..... اور بل کھانے سے پرہیز ہی کرنا چاہیے۔

پورے سات دن بیت گئے۔ تمھاری آواز کے ترنم سے محروم اور تمھاری سانسوں کی مہک سے دُور بیٹھا ہوں۔ میرا خیال تھا، شاید گاؤں میں وہ کرا امتحان کی تیاری کر پاؤں۔ وائے مگر یہ خیال حقیقت بنتا نظر نہیں آ رہا..... ایک ہفتے سے تنہا کمرے میں بند ہوں، لیکن ان سارے دنوں میں سات صفحے بھی نہ پڑھ پایا ہوں گا۔ ادھر میں نے کتاب کھولی، ادھر تمھاری تصویر آنکھوں کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ کوئی کیسے پڑھے؟ ابھی کچھ دیر قبل شہناز (میری بھتیجی) نے تمھارا خط مجھے دیا۔ میں پڑھنے لگا اور وہ قریب ہی بیٹھ گئی۔ شاید جاننا چاہتی تھی، خط کس کا ہے؟ آخر اس نے پوچھ لی لیا، میں نے کہا ”اپنی دوست کا.....“ اور وہ باہر چلی گئی۔

باہر صحن میں بچوں نے اس وقت ایک اُدھم مچا رکھا ہے۔ سکول سے آج چھٹی پر ہیں۔ صبح ہی سے کھیلتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ بھی رہے ہیں۔ خط لکھتے لکھتے قلم رکھنا پڑتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف احتجاجی مراسلے لیے میرے پاس آن پہنچے ہیں۔ فریقین کے دلائل سننے

کے بعد سیکورٹی کونسل کی طرح امن کا بھاشن دیتا ہوں۔ متنازع گینگد کو بین الاقوامی ملکیت قرار دیتے ہوئے، جارحیت کرنے والے کی زبانی سرزنش کرتا ہوں، معاہدہ امن طے پاتا ہے۔ فریقین دوبارہ باہر نکلتے ہیں۔ مگر دوسرے لمحے پھر جنگ کے ہاول چھا جاتے ہیں۔

جان لو۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک..... افراد سے لے کر اقوام تک..... سبھی جھگڑے 'میرے اور تیرے' کے پیدا کردہ ہیں۔ یہ میرا، تیرا، اگر ہمارے میں بدل جائے تو شاید فساد ختم ہو پائیں۔

میں جلد ہی یونیورسٹی واپس آنے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ آپ سے دور..... زندہ رہنا ہی بہت مشکل ہو رہا ہے، پڑھنے کی بات تو خیر بعد کی ہے۔ امتحان سر پر ہیں..... پورے دو سال میں قسم لے لو جو کبھی کلاس روم کا منہ دیکھا، پہلے سیاست ہوتی رہی پھر تم نے دل و دماغ کے سوتوں پر آن قبضہ کیا۔ سچ جانو، مجھے پاس ہونے کی بالکل اُمید نہیں ہے۔ تم جانے کیسے دو دو کام کر لیتی ہو، ہم تو ایک وقت میں صرف ایک ہی کام کر سکتے ہیں اور پھر اس امتحان کی مجھے فکر بھی نہیں۔ تمہارے والے ہی میں پاس ہو جاؤں تو سمجھوں گا کہ..... میں جیت گیا۔

ایک تو تم بڑے لوگوں کے بنائے ہوئے پرچے بہت سخت اور ہم ایسے لوگوں کے لیے تقریباً 'آؤٹ آف کورس' ہوتے ہیں۔ اس پرچے کا پہلا لازمی سوال ہی یہ ہوتا ہے کہ اُمیدواری ایس پی ہے یا نہیں..... اگر پرچہ آسان بنایا جائے اور دوسرے کچھ گیس بھی لگوا دیا جائے، تو کام ہو سکتا ہے۔ ورنہ میں نے دونوں امتحانوں میں فیل ہو جانا ہے۔ تمہارے بغیر شاید زندہ تو رہ پاؤں گا مگر جانے کیوں کر۔

تم نے بار بار لکھا ہے کہ میں امتحان کی تیاری کروں۔ چلو وعدہ کرو، تم مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاؤ گی۔ تو میں، تمہیں آج ہی..... لکھ دیتا ہوں کہ میں..... فرسٹ ڈویژن لوں گا۔ اگر نہ لے سکوں تو تم مجھے چھوڑ جانا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں تاکہ تمہیں پتہ چلے، میں اگر فیل ہو رہا ہوں تو اس کی وجہ میری کند ذہنی نہیں..... بلکہ تم ہو۔ امتحان میں صرف چند ہفتے باقی ہیں..... وعدہ کر لو..... پھر فرسٹ ڈویژن نہ آئے تو گولی مار دینا۔ ورنہ تم نے اتنی اُداسیاں دے رکھی ہیں کہ ذہن پر تھوڑے سے دباؤ سے رہتے رہتے ہیں۔ ایسے میں کوئی کیا پڑھے..... اور کیا لکھے؟ تم مستقبل کی تاریکیوں کا خوف ختم

کر سکتی ہو۔ صرف تم ہی مجھے بچا سکتی ہو..... صرف تم۔

یونیورسٹی کے کیا حال چال ہیں؟ تمہارے امتحان تو اب ختم ہونے والے ہوں گے؟ گلشن کا کوئی خط وغیرہ آیا ہے یا نہیں؟ صبیحہ کے کان کھینچ دینا۔ شاید خط کے ملنے تک میں بھی واپس آ جاؤں۔

بہت سنا پیار..... تمہارا ہمیشہ.....

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

۱۲۳ جنوری ۱۹۷۳ء

۱۲۹- سرسید ہال

رانی

میں گاؤں سے والہی پر بہت خوش خوش چلا کہ تمہارے درشن ہوں گے..... چنڈی سے لاہور کا مختصر سا سفر مجھے صدیوں سے زیادہ طویل لگا۔ کئی بار محسوس ہوا جیسے بس رینگ رینگ کر چل رہی ہو..... جانے منزل پر پہنچے گی یا.....؟ میں نے اس اذیت سے بچنے کے لیے بس کی آگلی سیٹ پر سر جھکا دیا..... اور آنکھیں بند کر کے..... تمہارے خیالوں میں گم ہو گیا۔ جذبات کی مٹا مٹا لہریں، حسین یادوں کے ساتھ، آہم رتی ڈوبتی اور چلتی رہیں۔ احساسات کے آفتابیں تانت پر گاہے جسم دھمکتا اور گاہے چمکتا رہا۔ سوچا جب تم سے ملوں گا، تو تمہارے منہ سے پہلا لفظ کیا نکلے گا؟ وہ آگئے..... نہیں شاید یہ کہو 'رہجہ صاحب آگئے'۔ تم مجھے ہمیشہ رہجہ صاحب ہی کہا کرتی ہو اور پھر جب کوئی دوسرا..... مجھے اس طرح بلاتا ہے تو جج جانو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا..... ایک اور چنگو لا آیا..... جب تم ملو گی..... تو کیوں نہ سبھی کے سامنے تمہیں سینے سے لگا لوں..... لوگ بُرا مناتے ہیں مناتے پھریں۔ میرا کیا بکا ڈلیں گے۔

کوئی گیارہ بجے ہاسٹل پہنچا۔ سامان کمرے میں پیکیج کر تمہارے ڈیپارٹمنٹ کی جانب دوڑا، مگر تم نہ تھیں۔ شیر ملک نے بتایا کہ صبح تم کینے میرا میں بیٹھی تھیں۔ وہاں پہنچا تو 'فل سائل' جیسے میرا ہی خنجر بیٹھا تھا۔ بھاگا بھاگا آیا اور پہلی ہی خبر یہ سنائی 'وہ تو خرم صاحب کے ساتھ کہیں شہر گئی ہے۔' غریب نے بڑے ڈکھ سے آہ بھری۔ ایک تو وہ پہلے ہی دیوانہ تھا اور پھر تم پر عاشق بھی ہو گیا۔ اب مت ہی ہوا ٹھیک۔ یہاں تو فرزانے، دیوانے ہو جاتے ہیں۔ اُس کا کیا ہے گا؟ ویسے بعض لڑکے بہت ذلیل ہیں۔ اُس بے چارے کو اتنا تنگ کرتے ہیں۔ آج اُس سے کینے میرا میں ڈانس کروا رہے تھے۔ اچھے دنوں بعد، میں اُس کے قابو چڑھا تھا۔ اُس نے

تمہارے اور اپنے 'عشق' کے ڈچر سارے قصے سنائے۔ پھر وہ خط زبانی سنایا۔۔۔۔۔ جو اُس نے حصیں لکھا تھا۔ کہہ رہا تھا، اس نے تمہارے لیے کوئی تحفہ خرید رکھا ہے۔ مجھے اس کی یہ ادا بہت پسند ہے۔ جب وہ حصیں دیکھ کر بڑے ہی سوز اور گہرائی سے 'اللہ' کا نعرہ لگایا کرتا ہے۔ اس لیے یوں لگتا ہے، جیسے واقعی اللہ سامنے آ گیا ہے۔۔۔۔۔ اُس کا بھی کیا تصور یہاں تو اچھے اچھوں کو خدا یاد آ جاتا ہے۔

ابھی کہنے لہریا سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ عطی، عارف، راجا اور بانو آ گئے۔ اُن کے ساتھ پھر چائے چلی۔ آخر میں نے عطی سے پوچھ ہی لیا۔ "لوگ کس حال میں ہیں؟" سبھی زیر لب مسکرا دیے۔ عطی بھلا ایسا موقع ضائع جانے دیتا۔ فوراً بولا "کون سے لوگ؟" نام لو تو پتہ چلے۔۔۔۔۔ یونیورسٹی تو لوگوں سے بھری پڑی ہے۔" قبیلہ برسا اور مجھے بھی مجبوراً ساتھ دینا پڑا۔

نازائیم الرحمن کو لیے ایک کونے میں دیکھتی تھی۔ دیکھ لو پھر ہماری بیٹھری بھی۔۔۔۔۔ ہم نے بہت پہلے 'میش کوئی' کر دی تھی۔ اب تو حصیں یقین آ یا کہ چکر چل رہا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگ بہت سادہ سہی۔۔۔۔۔ مگر باتیں کام کی بھی کہہ جایا کرتے تھے۔ کہادت ہے نا، عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔۔۔۔۔ اب خواہ دیکھ لیجئے یا سونگہ لیجئے۔ ہماری بات سچ نکلتی گی۔ اپنی طرف سے وہ 'بدلتے' رہی ہے۔ سوچتی ہوگی، اس طرح شاید میں اُس کے چکر میں پھر آ جاؤں۔ جب واسطے ہی نوٹ گیا، تو مجھے دکھ کیوں ہوگا۔ میں جانتا ہوں وہ صرف عورت ہے۔ ایک ایفونی عورت، جسے ہر لمحہ مرد چاہیے۔ بے چاری بد قسمت ہے کہ اسے ہمیشہ ہم ایسے 'چھوکت' مرد ہی ملے، جن سے ذائقہ تو بدل سکتا ہے۔ لیکن زندگی نہیں بدل سکتی۔۔۔۔۔

شام، ہاسٹل بھی گیا۔۔۔۔۔ مگر تمہارے 'دربان' نے نہایت عاجزی سے سر ہلا دیا۔ تم شاید امی کے ساتھ گئی ہوئی تھیں۔ تمہارا دربان، بہت تیز نظروں سے مجھے دیکھتا ہے۔ سوچتا ہوگا، ایک طرف کار چکر لگا رہی ہے اور دوسری طرف یہ شخص۔ تم لڑکیوں کے چوکیدار تو پورے پورے وزیر داخلہ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اُزتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔۔۔۔۔ ویسے ایک بات ہے۔ اس آدمی کی آنکھوں سے۔۔۔۔۔ تو مجھے ہر بار یہی محسوس ہوتا ہے، جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم کیوں خراب ہونا چاہتے ہو؟۔۔۔۔۔ دیکھ لو وہ بھی حقیقت جان گیا ہے! شاید، ہم غریب لوگ۔ ایک دوسرے کی غربت

سوگھ لیتے ہیں..... کار نہیں بیٹھ جائیں تو بھی نظر آ جاتا ہے جیسے کار سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اچھے
کپڑے پہن لیں..... تب بھی ہمارے جسم سے افلاس کے اندھیرے پھونٹے رہتے ہیں۔ کسی
اچھی عورت کے ساتھ ہوں تو بچتے نہیں.....

ڈیروں پیار

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

۱۲۸ جنوری ۱۹۷۳ء

۱۲۹۔ سرسید ہال

رائی

کیوں، پھر کیسا تھا؟ تم نے کہا تھا ”مجھے ایسے لگو گے جب بھی نہ بتاؤں گی اور نہ سے لگے جب بھی۔“ تم نے تو دل پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ اُس شخص کو ہر دوسرے روز خط لکھا جاتا تھا۔ ہمیں ہفتے میں صرف ایک بار قدم چومنے کی اجازت..... کینے میرا یکا بھی تھسٹ تھسٹ کر لے جانا پڑتا تھا۔ وہ آجائے تو ہم پہروں ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب..... ہاسٹل کے طواف کھینچتے پھریں، مادام کو مگر ہماری پرواہی نہ ہوتی تھی..... کل شام ہم اکٹھے تھے..... تم نے ہاتوں ہی ہاتوں میں بتایا تھا۔ ”ختم تمہارے پیر صاحب سے بھی ملے ہیں اور پیر صاحب رشتے کے لیے تمہارے ڈیڑی سے کہیں گے۔“ حالانکہ تم نے مجھ سے پرسوں خان والے کھوکھے پر وعدہ کیا تھا کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو، صرف میں ذرا سا شریف بن جاؤں تاکہ اس میں گھر والوں سے کوئی بات ہو سکے.....

جانتی ہو، ساری گڑبڑ اسی فوٹو نے کرائی ہے، جو کل میرے پاس رہ گیا تھا۔ جناب نے ساڑھی پہن رکھی تھی..... ماتھے پہ ٹیکا، دلہن سی بنی افسر کے ساتھ شرمائی لچائی کھڑی تھی۔ میں نے سوچا، تمہیں اگر یہ احساس دلایا جائے کہ میں تمہارے علاوہ بھی کسی لڑکی سے ملتا ہوں، اسے خط لکھتا ہوں، اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... اور تمہیں صرف فکر کر رہا ہوں، تو شاید دکھ کی اس شدید کیفیت کو محسوس کر پاؤ جس سے تم مجھے گزار رہی ہو۔ چنانچہ میں نے اُس ’لڑکی‘ کے نام خط لکھا..... اور تم تک پہنچا دیا۔ اس طرح کہ تم سمجھو، میں نے غلطی سے تمہیں دے دیا ہے..... اور تم نے خط پڑھتے ہی رونا شروع کر دیا۔ دیکھا تم نے جب پتہ چلے دوسرا صرف کھیل رہا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے؟

ایک بات اچھی ہوئی۔ تمہارے لگائے ہوئے سارے بند ٹوٹ گئے۔ تم نے غصے کے عالم میں اُن گنت بار کہا کہ تمہیں مجھ سے بہت پیار تھا۔ لیڈیز ہاسل کے باہر، جب تم غصے میں روتی ہوئی مجھ سے لڑ رہی تھیں، تو پتہ ہے تمہیں وہیں چوم لینے کو جی چاہتا تھا۔ مت پوچھو، میں نے کتنی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

ذرا اپنے دل کی گہرائی میں جھانکو، کہیں کوئی چنگاری جل رہی ہے..... جسے تم ہر لمحہ بجھانے کے ورے رہتی ہو..... مگر یہ چنگاری اب آسانی سے بجھ نہ پائے گی میری سرکار۔ یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے، میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔

وہ جو چند گھنٹے تکلیف ہوئی اس کے لیے معاف کرنا، بعد میں کیا خوشی نہیں ہوئی؟ جب اصل بات کا پتہ چلا..... کہ میں نے تو صرف سنجیدہ سا مذاق کیا تھا..... تم روتے روتے کتنے پیار سے مسکرا دی تھیں۔ مجھے تمہاری مجبوریوں کا علم ہے۔ مجھے پتہ ہے تم بھی ان دنوں بہت پریشان ہو۔ ایک جانب گھر والے..... دوسری جانب وہ شخص، جس کے حوالے سے تمہیں ساری یونیورسٹی جانتی ہے..... تیسری جانب میں ہوں، جس سے تمہیں چاہت بھی ہے..... جسے بھلا دینا اب تمہارے بس سے باہر نظر آتا ہے..... تم کنفیوز ہو کہ کیا کرو، کسے رکھو اور کسے چھوڑو؟ میں تم سے لڑتا رہتا ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے تم میری بنو نہ ہو میری دیوانگی کو کبھی بھی بھلا نہ سکو گی۔

ایک تو میں بہت دیر بعد دوڑا..... اور دوسرے میرا مقابلہ نئے مازیل کی خوبصورت کار سے ہے۔ میں مانتا ہوں، میں ہار جاؤں گا۔ آخر انسان ہوں مشین سے کیسے مقابلہ کروں؟..... پیار کے میدان میں وہ شخص مجھ سے شکست کھا چکا ہے۔ ورنہ اُس کے ہوتے ہوئے تم مجھے کیوں تانتیں؟ کل کیا ہوگا۔ کون جانے؟ آؤ آج کی بات کریں۔ اب تو صرف چند مہینوں کی مہلت باقی ہے۔ پھر ہم نے یہاں سے ہمیشہ کے لیے چھڑی جانا ہے..... اس سے پہلے کہ زمانے کا سیلاب زندگی کے موجودہ لمحات کو بہالے جائے مجھے اپنے دل کی دھڑکنوں کے درمیان سکون سے سانس لینے دو۔ اتنا قریب کہ تمہارے جسم کی خوشبو میرے اندر اتر جائے۔ اتنا پیار..... کہ میری سسکتی خواہشات کو قرار آ جائے۔ اتنے سانس میرے اندر داخل کر دیجئے کہ میرے پیچھے میرے

بھرا اس مہک سے آشاور ہیں۔ میرے جسم پر اپنی بخرو ملی انگلیاں اتنی بار پھیر دکھ لطف جذبات کے دھاؤں سے میرا گرم خون پھٹ کر باہر آجائے۔ میں کچھ زیادہ تو نہیں مانگ رہا تھا ہی فیصلہ کر دیا یہ زیادہ ہے اُن آہوں کے مقابلے میں جو میں نے تمہارے لیے بھر دی۔ اُن اذیت ناک لمحات کے معاوضے میں، جو میں نے تمہارے انتظار کی آگ میں جلائے۔ اُن دنوں کے سلسلے میں، جو میں نے تمہارے سائے کی تلاش میں بکھیر دیئے۔ ان راتوں کے بدلے میں جو میں نے جاگ جاگ کر گزار دیں..... یا پھر غم کی اس چٹا کے مقابلے میں جہاں..... میں نے آئندہ بھی جینا ہے..... اور جلتے ہی رہتا ہے۔

ہاں تو اس دن جماعت اسلامی والوں کا لکچر کیا تھا؟ کہہ رہے تھے ”خدا غریبوں کو پسند کرتا ہے۔ انھیں اگلے جہاں جنت دے گا۔ غربت تو صرف آزمائش ہے۔“ بعد میں میں نے اُن صاحب سے کہا تھا ”ہم کب کہتے ہیں کہ خدا غریبوں کے ساتھ نہیں۔ اگر جنت کا کوئی وجود ہے تو یقیناً اس میں غریب ہی جائیں گے۔ لیکن ہم امیروں کی مانند حاسد نہیں۔ ہم انھیں بھی اپنے ساتھ جنت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں دولت سے نجات دلا کر جنت کا حق وار بنانا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی دولت بچا کر انھیں کیوں دوزخی کرنے پر ابھند ہیں۔“

ان لوگوں کا اصل مسئلہ جنت ہے نہ دوزخ۔ یہ یہاں ہی چار چار بیویاں اور اُن گنت کینزیں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اپنی زندگی کو جنت نظیر بنانا چاہتے ہیں لیکن ہم بات کریں تو وعدہ حور پر ٹال دیتے ہیں۔ اصل مقصد دولت کی حفاظت ہے۔ یہ جتنے امیروں کے وفادار ہیں، اگر اسے خدا کے ہوتے تو آج دنیا بدل چکی ہوتی۔

پرسوں رات کا پروگرام بن جائے..... یاد ہے نا کبھی وعدہ ہوا تھا؟ امی تو آچکیں، اب بھلا کیسے۔ میری چھاتی پر سر رکھ کر سو جانا۔ یہ بھی بہت زیادہ ہے!

ڈھیروں پیار کے ساتھ

۱۵ فروری ۱۹۷۳ء

۱۲۹۔ سرسید ہال

کنول

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی 'گھر سے سخت خط آ گیا ہے' 'لوگ باتیں بناتے ہیں' 'پتہ نہیں کیا ہوگا؟' 'یہ سب اوٹ پٹانگ سوچ کر خود پریشان ہوتی پھر دو اور مجھے بھی پریشان کرو۔ مجھے تو تمہاری یہ پریشانی فضول لگتی ہے۔ لوگ تو پھر لوگ ہیں، خدا کو بھی نہیں چھوڑتے ہمیں کہاں معاف کریں گے؟ مگر ان سے ڈرنا نہیں چاہیے، جو ڈر گیا جان لو مر گیا۔

کوئی ہم سا آدمی نگر مند ہو تو ایک بات بھی ہے۔ دیکھ لو، تمہارے بغیر اگر زندہ رہنا پڑا تو شاید پچاسی کے تختے پر کھڑے ہو کر زندگی گزارنا پڑے گی..... پھر بھی تمہارے سامنے ہمد وقت ہنسنے مسکراتے پھرتے ہیں۔

حصص یہ تو سوچنا چاہیے کہ کچھ لوگ تمہاری مسکراہٹ سے زندگی لیتے ہیں۔ تم جو سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ، تو پھر ان کا کیا حشر ہوگا؟ کبھی انسان کو دوسروں کے لیے مسکراتا پڑتا ہے اور کبھی رونا۔ یہ دونوں کام اپنی اپنی صورت حال کے حوالے سے جائز ہیں۔ چلے..... اب مسکرا دیجئے۔

مجھے پتہ ہے 'صاحب' سے تمہارے سلسلے کی جھنک گھر تک پہنچی ہوگی۔ جیسی تمہاری بہن نے احتیاطاً خط لکھ دیا ہے۔ وہ شریف آدمی تو اب یہاں ہے نہیں، مگر اس کی دی ہوئی پریشانیوں کا ذکر بھی ہمیں کو اٹھانا پڑتا ہے۔

مگر تم 'اعکاف' سے باہر تو آؤ۔ جو ہونا تھا، اس میں سے بہت کچھ ہو چکا، باقی نے ہو جانا ہے، پھر یوں رونے دھونے سے فائدہ؟ میں پیغمبر تو نہیں، پر تم میری ایک بات لکھ لو۔ تمہاری شادی بہر حال 'اُسی' خوش نصیب سے ہوتی ہے۔

تمہارے کزن کو تم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ رہ گیا میں، بھلا مجھے کس نے پوچھا ہے؟ ارے

بھائی، میں تو وہ گروکارواں ہوں جسے لوگ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی حجاز دیا کرتے ہیں۔ پرسوں صبح ہم لوگ اسمبلی ہال کے باہر مظاہرہ کرنے جا رہے ہیں۔ روبیہ تمہیں ساری تفصیلات بتا دے گی۔ دراصل یہ اُسی کا بندوبست ہے۔ شہر میں کوئی فیکٹری ہے۔ جہاں مزدور خواتین سے بُرا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس لڑکی روبیہ کا حوصلہ دیکھو اُس نے حقیقت حال کو کھوج لگانے کے لیے چند دن وہاں ملازمت بھی کی۔ مظاہرے پر بہت سی لڑکیاں جا رہی ہیں۔ تم شاید وہ ملک کو بھی لیتی چلتا۔ اُس نے یوں بھی ہر روز آنکھیں دکھانے ای۔ پلومر (E-Plomer) والوں کے پاس جانا ہوتا ہے۔ بارہ بجے تک جلوس سے فارغ ہو کر ای۔ پلومر چلے چلیں گے۔ شاید وہ آنکھیں دکھائے گی اور ہم وہیں سے..... کسی نئی فلم پر پھوٹ لیں گے۔

یاد آیا دی کو سیز؟ کیسی تھی؟ مجھے تو بہت اچھی لگی۔ فلم کے آخری حصے میں تو ہانکل ہم دونوں کی سی چھوٹکھن ہے۔ بڑے آدمی کی بیوی نشے میں بہک کر اپنے نوکر کو ساتھ سلا لیتی ہے مگر صبح اُسے پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے۔ کئی بار یوں ہی ہوتا ہے..... فلم دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ تم نے بھی پہچاننے سے انکار کرو یا تو؟..... ہاں مگر یاد رکھنا وہاں سے سُوری بدل جائے گی..... کیوں کہ میں ذرا بگڑا ہوا نوکر ہوں..... دھیان ہی رکھنا۔ تم نے کہا تھا کوئی لڑکی نیلہ۔ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں تو اُسے جانتا نہیں، کیسی چیز ہے؟..... اور کیوں ملنا چاہتی ہے؟ اُسے بتانا، لوگ تو بڑے آدمیوں سے ملا کرتے ہیں۔ میں ایک چھوٹا انسان ہوں۔ مجھے مل کر اُسے کیا فائدہ ہوگا؟ صبیحہ بہت جھگ کرتی ہے۔ ذرا اُس کے کان کھینچ دیا کرو۔ یا اُس کا کوئی 'بندوبست' کرو۔ یہ لڑکیاں، ورنہ اسی طرح لڑکیاں ہی رہتی ہیں۔ عورتیں نہیں بنتیں.....

'سنسٹوش' سے آج کل کیا بگڑ گئی ہے؟ تمہاری موجودگی میں وہ کھل کر بات نہیں کرتی اور ہاں برقعے والی احمدی لڑکی سے کہنا، میں 'خدا کے وجود پر بحث نہیں کرتا۔ خدا کو ثابت کرنے کی بجائے اُسے مان لینا چاہیے۔ اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔ دل کی گہرائیوں سے 'ہاں' کی آواز اُٹھے، تو بس کافی جانو۔ میں نے کسی سے سنا تھا۔ وہ مجھ سے اس سلسلے میں بحث کرنا چاہتی ہے۔..... کمر میں جانے کیوں شدید تکلیف ہو رہی ہے۔

اب اجازت دیجئے۔

یکم مارچ ۱۹۷۳ء

دیوی

پھر پسند آیا طارق عزیز؟ کل رات اُس کی قلم کے سیٹ پر جب تم نے میرا ہاتھ تھاما۔ تو وہ میری جانب دیکھ کر خوشی سے مسکرا دیا تھا۔ آدی بہت پیارا ہے۔ جو کبھی ہم سفر نہ تھے، کہاں سے کہاں پہنچے۔ وہ ہے کد اپنی ہی طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔ نیکی خان کے دور میں اُس کو سزا ہو گئی وہ فلمی دنیا کی 'جنت' سے چل کر جیل کے 'دوزخ' میں آن پہنچا۔ بے چارہ اپنے ساتھ ہی 'سی کلاس' میں تھا۔ مگر اُس کا سر نہ جھکا..... یہ اُس کی اتالیقت تھی۔ دوسری جانب اُس کی انسانیت دیکھو کہ ایک مرتبہ چندہ لینے اُس بازار میں گیا۔ کسی طوائف نے ساری پونجی اُس کے حوالے کر دی۔ طارق نے بھرے بازار میں اُس کے پاؤں چوم لیے۔ ایک دفعہ میں نے اُس کے ساتھ انتہائی نلکا سلوک کیا۔ جب ملا تو اُس نے شکوہ کرنے کی بجائے اپنے سمندر جیسے فراخ دامن میں مجھے یوں سمیٹ لیا جیسے وہ صدیوں سے میرا ہی منتظر تھا۔

ہاں شاہدہ ملک نے آج شام یونیورسٹی سے چلے جانا تھا۔ دن کو میں اس سے ملا تھا۔ سچ پوچھو، تو اُس کے جانے کا مجھے بہت دکھ ہے۔ تم اسٹیشن تک اسے خدا حافظ کہتے مئی ہوگی؟ مجھے بھی آنے کو کہہ رہی تھی مگر میں نے اسے بتایا کہ میں دوستوں کو جاتے ہوئے..... اور انسانوں کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ بعد میں یہی منظر آنکھوں کے سامنے بھرتا رہتا ہے..... اچھی لڑکی تھی۔ اسے خدا کبھی دکھ نہ دے۔ اُس کے بغیر ہاسٹل حمیس بھی سوناٹو نا لگتا ہوگا اور بقول تمہارے 'خاہری بات ہے'۔

سنو تمہارا 'صاحب' ٹھیک ہی کہتا ہے، واقعی ہم بھی کیا ناکارہ لوگ ہیں دن بھر چائے پیتے ہیں، ہنگریٹ چھوکتے ہیں..... اور انتھاب کے نعروں.....، جامدہ کے 'شائین' بچوں اور بچیوں کے

سکون میں نخل ہوتے ہیں۔۔۔۔۔

اگر کبھی موقع بنے تو اُسے میری جانب سے کہہ دینا۔ تاریخ کوئی حسین دوشیزہ نہیں، جسے ماڈل کی کار کے ذریعے فتح کیا جاسکے۔ اُس نے آج جو زندگی اپنا رکھی ہے۔۔۔۔۔ میں نے اُسے رد کر دیا تھا۔ اور کل یہ بات اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ممکن ہے، اُس جیسے 'حادثاتی' بڑے کسی زمانے میں ہونے قرار دے دیئے جائیں اور اگر اُسے اپنے بڑے ہونے کا واقعی شک ہے تو اُسے کہو، دنیا کے کسی میدان میں میرے ساتھ مقابلہ کر دیکھے۔۔۔۔۔ (سوائے تمہارے)

میں نے دور کا نیا انسان ہوں۔ میں مردانہ رقابتوں کا قائل نہیں۔ میں نے بچپن میں اکثر دیکھا ہے کہ جنس کے معاملے میں طاقتور نل، اپنے سے کمزور کو ہمیشہ مار بھگاتا ہے۔ تو مند کتا دوسروں کو بچھاڑنے کے بعد، جنس سے متنبہ ہوتا ہے اور ہمارے سماج میں دولت والا۔۔۔۔۔ اسی طرح دوسروں سے یہ حق چھینتا ہے۔۔۔۔۔ میں نل نہیں بننا چاہتا۔ میرے پاس شعور کی لازوال رفعتیں ہیں۔ میں انسان ہوں۔۔۔۔۔ اور عظمتیں میری خاک پا سے جتم لیتی ہیں۔ میرے نزدیک عورت اپنے گمراہ سینے، سفید رانوں۔۔۔۔۔ اور ابھری چھاتیوں سے علاوہ بھی کچھ ہے اور وہ یہ کہ انسان ہے۔ محبت اور جنس (Sex Love and)۔۔۔۔۔ درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ جنس کے بغیر محبت کی حیثیت دیوانے کے خواب کی سی ہے اور محبت کے بغیر جنس، محض خود لذتی ہے۔ ہمارے یہاں جنس کو شادی سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ شادی تو دو انسانوں کے درمیان محض ایک سماجی معاہدے کا نام ہے۔ ایک طرح کا معاشرتی تحفظ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں تم عورتوں کو جنس سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ مردوں سے خوف زدہ کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ دیکھو تا تم غم سے ملتی تھیں۔ اُس کے بعد مجھ سے ملیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ آخر کسی عورت سے تمہارا فخر کیوں نہ ہوا۔۔۔۔۔ پھر اگر ہم دونوں میں سے کوئی تمہیں بتا دے کہ وہ مردانہ اوصاف ہی نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ تم اسے درمیانی جنس جان کر دوسرے لمحے ہی چھوڑ جاؤ گی۔ ہم ماٹیں یا نہ ماٹیں عورتیں اور مرد کے مابین محبت کی تہ میں جنس کا رُخسار پورے طریقے سے موجود ہوتا ہے۔ جسے ہم اپنی معاشرتی اقدار کے خوف سے۔۔۔۔۔ لاشعور میں دھکیل دیتے ہیں۔ میں تمہیں دلچسپ بات بتاؤں کہ جنسی لذت۔۔۔۔۔ کا تعلق ایک جانب تو جسم سے ہے اور دوسری جانب ذہن سے۔۔۔۔۔ دونوں پہلوؤں کی تکمیل ضروری

ہے۔ ورنہ.....جنسی ملاپ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انسان آسمانوں کی بلندیوں سے.....
 زمین پر آن گرا ہو۔ لہذا میرے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا گناہ.....کسی عورت کے ساتھ زبردستی
 سونا ہے۔ تم تو میرے ساتھ راتوں کو باہر رہی ہو۔ کیا میں نے تمہیں کبھی یہ محسوس ہونے دیا کہ میں
 صرف مرد ہوں، جب تک اندر کی چاہت.....جسم کی چاہت کے ساتھ ساتھ نہ ابھرے، میں کسی
 عورت کے ساتھ سو نہیں سکتا اور اندر کی چاہت کے لیے لازم ہے کہ.....باہمی پسندیدگی ہو اور
 ایک دوسرے سے گہری شناسائی ہو۔ کیونکہ میرے نزدیک عورت سے ملنا.....ایک مقدس فعل
 ہے۔ اب ان مردوں کی نفسیات دیکھو، سمجھتے ہیں، اُن کا کام تو صرف سونا ہے اور بس.....ہر راہ
 چلتی مناسب عورت کو کھانے دوڑتے ہیں۔ چونکہ انہیں سماجی برتری حاصل ہے اس لیے اُن کی
 اپنی عصمت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ عزت، وقار، غیرت اور حیا جیسے تمام لغو تصورات انہوں نے تم
 عورتوں کی دم کے ساتھ ہاندھ رکھے ہیں۔ ان مردوں کو کون سمجھائے.....اگر حیا واقعی کوئی شے
 ہے تو پھر دونوں اصناف کے لیے ہونی چاہیے۔ انہیں کون بتائے کہ جب وہ عورت کے ساتھ
 سوتے ہیں تو.....اپنی بھی عصمت دری کر رہے ہوتے ہیں۔

تم نے دیکھا نہیں شادی شدہ مرد بھی دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔ میرا
 خیال ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ جنس کو صرف سفید راتوں تک محدود سمجھتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ
 سے زیادہ رانیں اکٹھی کرنے کے لیے دوڑتے دوڑتے زندگی سے گزر جاتے ہیں۔ وہ جنسی ملاپ
 کے ذہنی پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اس لیے ذہن کی بھوک کو بھی.....جسم کے گوشت سے پورا
 کرنے کی سعی ناکام میں، ایک کے بعد دوسری.....پھر تیسری.....کی تلاش میں مصروف رہتے
 ہیں۔ جنسی ملاپ تو ایک تخلیقی امر ہے.....ہمارے لوگ اس کو میکاکی انداز میں سرانجام دیتے
 ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ بیوی خاوند.....ملنے تو ایک دوسرے سے ہیں لیکن آنکھیں بند کر کے، ہر روز نئی
 عورت اور نئے مرد کو فرض کرتے ہیں.....

اور سنو، انڈونیشیا میں ایک قبیلہ ہے۔ جہاں عورت خاندان کی سربراہ ہے۔ مرد وہاں بننے
 ہیں۔ وہاں عورتیں مرد کو پھانسنے کے لیے اسی طرح دوڑتی ہیں جیسے تم لوگوں کا تعاقب مرد کرتے
 ہیں۔ اُس قبیلے کے مرد ہا قاعدہ شرماتے لپاتے.....اور سولہ سنگار کرتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں بددیانتی کا یہ عالم ہے کہ ہر کوئی ہر کسی کو دھوکا دینے جانتا ہے۔ ہر مرد کے نزدیک اُس کی ماں، بیٹی، بہن اور بیوی..... پاک دامن ہیں۔ جب پارسی کا یہ عالم ہے تو، پھر خراب جانے کون ہے؟

لوگ خوش فہموں کی دنیا بسائے بیٹھے ہیں۔ اندازہ کرو۔ تم مجھ سے چپ چپ کر ملتی ہو مگر وہ شخص جس میں حور سمجھتا ہے۔ تم اُسے 'فرشتہ' کہتی ہو حالانکہ وہ بھی حور ہی کی مانند 'فرشتہ' ہوگا۔ میں حقیر سا انسان تم فرشتوں اور حوروں کے درمیان پس کر رہ گیا ہوں۔ تم میرے سامنے ایک اور مرد سے ملتی ہو۔ میں جس میں پھر بھی دیوی کہتا ہوں۔ وہ نہیں جانتا تم کسی اور سے ملتی ہو، اس لیے تجھیں 'حور' جانتا ہے۔ تم سے کون زیادہ پیار کرتا ہے۔ تم ہی فیصلہ کر لو؟

تم نے جلد ہی یہاں سے چلے جانا ہے۔ امتحانوں کے بعد میں بھی یہاں نہ رہوں گا۔ مجھے پتہ نہیں، پھر وہ بارہ زندگی کے کس موڑ پر جانے کیسی حالت میں ملے ہیں؟ ہو سکتا ہے ایسا زمانہ آجائے کہ تم مجھ سے بات کرتا بھی مناسب نہ سمجھو۔ میں الفاظ کے وعدوں کو بے جان اور بے معنی سمجھتا ہوں، تاہم تم نے خود ہی کہا تھا کہ اگر تم میری نہ بن سکیں تو بھی ہر حال میں مجھے ملتی رہا کرو گی۔ میں الفاظ کی بجائے عمل کا عادی ہوں..... میں بھی تجھیں چاہتا ہوں..... اور وہ شخص بھی خود کو تمہارا دیوانہ کہتا بھرتا ہے۔ اُس سے پوچھو کیا وہ شادی کے بعد تجھیں..... مجھ سے ملنے کی اجازت دے گا؟ اور وہ نہ کروے تو خدا کے لیے میرے پاس لوٹ آنا..... میں تم پر کبھی کوئی پابندی نہ لگاؤں گا۔ تم اگر چاہو تو اُس سے ملتی رہا کرتا..... میرے نزدیک چپ کر ملنے اور اپنے آپ کو دھوکا دینے سے تو کہیں بہتر ہے کہ انسان، بغیر کسی خوف کے پورے اعتماد اور خلوص کے ساتھ جسے ملنا چاہے اُسے ملے۔

اگر کوئی یہ بات سن لے تو مجھے دیوانہ سمجھے..... سچ ہی تو ہے، جہاں لوگ عمر بھر چند بے معنی تصورات کے دائروں میں مقید رہتے ہیں، میں وہاں..... انسانی عظمتوں پر اعتماد کی بات کرتا ہوں۔

یاد ہے جس میں ایک دن ہم شاہ جی کے ہاں گئے تھے۔ تم چار پائی پر بیٹھی تھی..... اور میں لیٹا تھا۔ شادی کی بات ہو رہی تھی، میں نے تجھیں کہا تھا "تم بڑے لوگ صدیوں سے ہم ناداروں کے

آقا رہے ہو۔ تم نے جب چاہا ہماری بہو بیٹیوں سے اپنے حرم سجائے۔ جب چاہا اُن کے ساتھ رنگ رلیاں منائیں..... ہمیں کھلوٹا بنایا اور جب چاہا توڑ دیا..... تم تو باشعور ہو، نئے دور کی پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اگر میرے ساتھ جھونپڑے تک آ جاؤ..... تو کیا قیامت آ جائے گی..... اگر تم کسی سپاہی کے بیٹے کے ساتھ غربت میں زندگی بسر کر لو، تو کیا زمین اپنی گردش چھوڑ دے گی؟ سورج اندھا ہو جائے گا؟ ستارے ٹوٹ جائیں گے؟ یا تاریخ انسانی کا دائمی دھارا اپنے سے انکار کر دے گا؟ اور اگر کچھ بھی نہیں ہو گا تو..... تو خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ اور تم رو کر مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔ میری بنیان تمہارے آنسو کے سیلاب سے بھیگ نکلی تھی۔ جہاں تم نے منہ رکھا تھا۔ وہاں تمہاری لپ اسٹک، میری بنیان پر ایک خوبصورت بو سے کا نشان چھوڑ گئی..... اور مجھ چھوٹے آدمی نے وہ بنیان سنبھال کر رکھ لی۔ اُس دن تم مجھ غریب کے لیے روٹی تھیں..... تمہارے آنسو، آپ کوڑ سے کم نہ تھے..... میری خواہش ہے کہ وہ بنیان میں قبر تک ساتھ لے جاؤں کہ میرے پاس اس زندگی کا..... کل اثاثہ یہی ہے۔

کل رات باہر رہنے کا تو کسی کو پتہ نہیں چلا؟ آج دن بھر تم نظر نہیں آئیں اس لیے مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔ اب سوچ کر دل کو تسلی دے رہا ہوں کہ تم دن بھر سوتی رہی ہو گی۔ تمام رات اپنے بازو پر میرا سر رکھے، تم میرے بالوں میں اپنی غردلی انگلیاں پھیرتی رہیں۔ رات کو جب بھی میری آنکھ کھلی، میں نے تمہیں اسی حالت میں جاسگتے پایا۔ میرا خیال ہے تم بالکل نہیں سو پائیں۔ تہاؤں ایسا کیوں ہے؟

ڈھیروں پیار

لڑکی

پھر تمہارے 'صاحب' سے ملاقات ہوئی گئی۔ کچ پوچھو تو میں اس اچانک ملاقات کے لیے ذاتی طور پر تیار نہ تھا۔ شاید خرم بھی میری ہی طرح ایسے کسی موقع کے لیے آمادہ نہ ہوا ہوگا۔ لہذا بات رکی بیلو، بیلو سے آگے نہ چل پائی۔ میں نے تمہاری جانب دیکھا، پل بھر کے لیے تمہارے ہونٹ پھیلے لیکن تمہارا چہرہ احساسِ نزع کے کرب میں ڈوبا نظر آیا۔

ہیالی پر ہنکتے ہوئے میں نے سوچا یہ شخص میری ضد ہے۔ اُس نے مجھے عروسیوں کے اُن گنت زخم دیئے ہیں۔ ایک اور قلابازی آئی۔ نہیں وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہاری آغوش کی خوشبو سے آشنا ہے۔ میں اور وہ دواپسے دریاؤں کی مانند ہیں جو مختلف سمتوں میں بہنے کے باوجود ایک ہی سمندر میں گرتے ہیں۔ اس لمحے وہ مجھے اچھا بھی لگا۔ پھر میری نظر اس کے ہونٹوں پر گئی۔ تمہارے ہونٹوں پر بوسہ ہوتے ہوں گے اور میرا جیسے سارا خون پھٹ کر باہر آنے لگا۔ ایک اور موڑ آیا۔ یہ آدمی زیادہ سے زیادہ تمہارے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اپنے ایسے چار پانچ بچے پیدا کر سکتا ہے اور بس! یہ کام تو وہ کسی بھی عورت کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ کیا ضرور کہ تم ہی ہو؟ اتنے میں صبیحہ تے جیسے پوری پانچ صدیوں کے سکوت پر ہتھوڑا برسایا۔ شکر جانو وہ کہیں سے نازل ہوگئی۔ ورنہ ہم تینوں جانے کب تک یوں ہی غمِ ضم بیٹھے رہتے۔ خرم اُس کے ساتھ ہاتھیں کرنے لگا اور میں نے جانا جیسے قبر سے باہر آ گیا ہوں۔ جوں ہی صبیحہ واپس مڑی میں بھی اٹھا۔ خرم کے چہرے پر طمانیت کی گہری لکیر ابھری۔ تم نگاہا اپنے آپ پر قابو پا چکی تھیں۔ تاہم مجھے کسی ذرا فائدہ سارے کی طرح نظر آئیں جو اپنے مدار سے ہٹ کر خلاؤں میں کھو چلا ہو۔

میں اور صبیحہ ہاشل کی جانب چلے۔ راستے میں نازکاب کی کیار یوں پہنچی پھول تو زری تھی۔

’مثنائی‘ کی علامت کے طور پر میں نے اسے سفید گلاب کا پھول پیش کیا اور باقاعدہ کورٹش بجالایا۔ وہ شیطانی نظروں سے مسکرا دی پھر میں نے کانٹوں میں الجھا اس کا سفید دوپٹہ جھک کر چھڑایا۔ صبیحہ قریب کھڑی مسکراتی رہی۔ کہنے لگی ”خدا خیر کرے آج ناز کی بڑی خدمت ہو رہی ہے۔“ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا ناز نے اُنہی کے اشارے سے صبیحہ کو سمجھایا ”دماغ چل گیا ہے۔“ اور ہم تینوں ہنس دیئے۔

میں اُن دونوں کو پھولوں کے وامن میں چھوڑ کر سوچوں کے نوکیلے کانٹوں پر چلتا ہوا یونیورسٹی سے باہر کھلے کھیتوں کی جانب نکل گیا۔ زیرِ تعمیر مسجد سے ذرا پرے ایک منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اُسی جگہ جہاں رؤف (عطی) نے پوائنٹ ۲۲ کی رائفل سے فاختہ کو نشانہ بنا کر تم سے فلم کی شرط جیتی تھی..... اور پھر مجھے وہ منظر یاد کر کے ہنسی آگئی۔ ٹھل نے رؤف (عطی) کو اپنی کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور ہم سب اس کے ارد گرد شیر کیمپس‘ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ شاہدہ نے نکل کو، ذرا سادھا کا لگا دیا اور بے چارہ شیر کیمپس لڑھکتا ہوا کھیت میں جا گرا تھا۔ میں اس جگہ بیٹھے بیٹھے مجھے احساس ہوا جیسے میں ڈی فاختہ ہوں اور کھیت میرے رستے خون سے بھر گئے ہیں۔ کیا لوگوں کی آنکھیں یہ سب کچھ دیکھنے سے معذور ہیں؟

ذہن نے ایک اور انگڑائی لی۔ دو متضاد انسانوں سے بیک وقت پیار کرنا ممکن ہے؟ یاد ہے نا، جب پہلے دن ملے تھے۔ شدید قربت کے اُن لمحات میں میرے منہ سے بے اختیار اس گاؤں والی لڑکی کا نام نکل گیا تو..... تم ناراض ہو کر اٹھ بیٹھی تھیں۔ پھر میں نے ایک طویل خط میں تفصیل سے اپنا ماضی لکھا تھا۔ اور اب یہ عالم ہے کہ کسی کو بلاؤں تو زبان سے تمہارا نام بہہ نکلے گا۔ جانے تم دو آدمیوں سے بیک وقت پیار کے گرم اُٹلتے جذبات کے ساتھ کس طرح ملتے ہو۔ کوئی ہم سا ہو تو ایک شغل برپا کرے۔ ایک سے دوسرے کا ذکر چلے اور دوسرے کے ساتھ پہلے کی باتیں ہوں اور دونوں ہی اپنے اپنے کیے اور نہ کیے پر شرمندہ ہوتے رہا کریں۔

پھر مجھے تمہاری وہ بات یاد آئی ”میں کوئی مشین تو نہیں انسان ہو۔ دو آدمیوں سے بیک وقت ایک سا پیار کیسے کر سکتی ہوں۔ ماں بھی اپنے بچوں سے یکساں پیار نہیں کر سکتی۔ غرم کے بیٹھے بیٹھے اچانک خیالوں میں کھو جاتی ہوں۔ جانتے ہیں، اُس وقت میں آپ کے متعلق سوچ رہی ہوتی

ہوں۔ آپ دونوں کی عادتیں ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہیں۔ ہر بات پر مجھے دوسرا یاد آ جاتا ہے۔ شام کے وقت میں خرم کے ساتھ کار میں بیٹھے آپ کو کہنے کے آس پاس ٹپکتے دیکھا کرتی ہوں۔ پچھلے دنوں آپ نہیں تھے۔ آپ کی قسم مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ اب تو خرم بھی مجھے کئی دفعہ کہہ چکا ہے کہ تم بدلتی جا رہی ہو۔ ایک دن میں آپ کے متعلق بات کر رہی تھی تو اُس نے کہا 'یوں لگتا ہے کہ شادی کے بعد مجھے اپنے گھر میں ایک کمرہ تمہارے روحانی پیغمبر کے لیے مخصوص کرنا پڑے گا اور اس کمرے میں مجھے داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی' لیکن آپ بھی مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ میں کہاں جاؤں؟"

اور میں نے حمیس شاہدہ کے سامنے ہی سینے سے لگا لیا تھا۔ صبیحہ اور شہلا، عثمان سے سکوتر چلانا سیکھ رہی تھیں اور ہم اندھیرے میں ڈوبے، کہنے پیریا کے ایک کونے میں بیٹھے بظاہر اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ صبیحہ ہم تینوں پر معنی خیز آوازیں بھی لگا رہی تھی۔ تم نے اتنی کمال کر بات کی تھی اور شاید میں کبھی بھی یہ بات بھلا نہ سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم انسانی زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جاؤ گے۔ حمیس یہ کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ ہم دونوں اکٹھے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آ رہیں گے۔ میں یہی کچھ سوچتا ہوا وہاں سے واپس چلا۔

روڈ (عطلی) کے ساتھ ایک شام منائی جائے۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ جب وہ پیدا ہوئے تو..... اُن کی ماں نے لاڈ سے کہا تھا "میرا بیٹا مجسٹریٹ بنے گا۔" چنانچہ جناب نے خاموشی سے مجسٹریٹ کا امتحان دے مارا ہے۔ بڑی مشکل سے یہ خبر سمجھنی ہے۔ پروگرام بنا ہے کہ جب وہ ہم میں سے کسی کو نظر آئیں۔ فوراً کہا جائے "ماں کا کیا ہوتا ہے۔ وہ بے چاری تو پیار کے مارے کہہ دیتی ہے۔ میرا بیٹا کرل، جرنل، بنے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیٹا بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے۔ چلو اگر ماں نے غلطی سے کہہ ہی دیا تھا کہ میرا بیٹا جج بنے گا۔ حمیس تو کچھ احساس ہونا چاہیے تھا۔" بھائی صاحب کو دیکھو کیا خواب دیکھ رہے ہیں؟

عوامی میلے پر ضرور چلیں گے۔ کارڈز کا کوئی بندوبست کرا لیں گے۔ جس دن بھٹو صاحب آئیں اُس دن چلنا چاہیے اُن کی تقریریں لیں گے۔ ویسے اُس دن رش بہت ہوگا۔

میرا خیال ہے صبیحہ کو شک ہو گیا ہے۔ وہ بڑی معنی خیز باتیں کر رہی ہے۔ بچی تو نہیں، ہر

وقت ساتھ رہتی ہے۔ مانا کہ ہم کسی کے سامنے کوئی بات نہیں کرتے۔ پھر بھی لوگ ہماری آنکھوں سے پیار کا اظہار طوفان تو دیکھ ہی سکتے ہیں نا۔ صبیحہ کم از کم اتنا ضرور جانتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے اُسے اعتماد میں لے لی لو۔

سائیکالوجی پر جنسیں دو کتابیں بھجوا رہا ہوں۔ دونوں فرائڈ پر کنٹری ہیں۔ تم نے فرائڈ پر جو کتاب مانگی تھی، وہ ہماری لائبریری میں موجود نہیں۔ شعبہ نفسیات میں ہوتو، مہ جنیں وغیرہ سے کہہ دینا وہ جنسیں لا دیں گی۔ تو بہ تو بہ تمہارے استاد بھی کتنے بے سرے ہیں کہ فرائڈ کو صرف اور صرف جنس کا بادشاہ سمجھتے ہیں۔ فرائڈیکس یعنی جنس کے عام تصور کی بات نہیں کرتا۔ وہ ایک نئی اور جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ فرائڈ Libido کو زندگی کی قوت محرکہ گردانتا ہے۔ وہ اُس کو محض جنس قرار نہیں دیتا۔ اگر تمہارا کوئی استاد Libido کا ترجمہ سیکس کرتا ہے تو وہ فرائڈ پر بھی ظلم کر رہا ہے اور ظلم پر بھی۔

فرائڈ نی یہ غلطی نہیں کہ اُس نے جنس کی اہمیت کو بنیاد بنایا۔ اُس کی بنیادی غامی یہ ہے کہ وہ انسان کے افعال کو لاشعور کے اندھے دیوتا کی جینٹ چڑھاتا ہے۔ وہ حال کو ماضی کا تابع بنا دیتا ہے۔ وہ معاشرے کی ٹھوس مادی صورت کو جھٹلا کر ماورائیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ شعور یا تحت الشعور فرد اور معاشرتی صورت حال کے اتصال سے جنم لیتا ہے۔ معاشرہ اور اُس کی مادی صورتیں فرد کی نفسیات کو مرتب کرتی ہیں اور پھر فرد اپنے افعال سے گرد و پیش کو بدلتا ہے۔ اپنے آپ کو بدلتا ہے۔ عمر بھر اپنے خیالات اور عادات میں قطع و برید کرتا رہتا ہے۔ جب کہ فرائڈ کا انسان ایک مفعول، مجبور محض اور اپنے لاشعور کا ابدی غلام ہے۔ تاہم، یہ دونوں کتابیں پڑھ لو۔ کسی دن بحث کر لیں گے۔

بہت سا پیار

تمہارا ہمیشہ

۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء

لیاقت ہال

میری زندگی

آج شام وہی کسی کے وقت تھیں جانے کیا ہو گیا تھا۔ ایک قدم اکیلے چلنے کو تیار تھیں۔ ایک ہی ضد تھی "ہاٹل تک آپ ساتھ چلیں"۔ پتہ ہے راستے میں کتنے لوگوں نے ہمیں دیکھا؟ اور جو کوئی بات بنائے گا پھر مجھے کوئی پھر وہی۔ مہ جیں اور طلعت وغیرہ نہر کی اس جانب سے معنی خیز مسکراہٹوں کے تیر پھینک رہی تھیں۔ یاد ہے نا وہ پہلے بھی اشارہ کیا کہ بچی ہے "خرم بہت اچھا آدمی ہے۔" احتیاز بانو بھی کھکھلا دی۔ چلو خیر، خدا اسے خوش رکھے، وہ انواہ ساز لڑکی نہیں۔ نہر کی پٹی پر خیم اور بلو وغیرہ کھڑے تھے اور یہ سارے لوگ ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے اور تم اتنی اپ سیٹ تھیں کہ چلتے ہوئے مجھے سے ہار ہار کر رہی تھی۔ بدلی بدلی سے، خوف زدہ سی، پیاری پیاری سی۔

جاتی ہو اس وقت مجھے کیا یاد آرہا ہے؟ وہ اہول لمحات جب ہم شاہ جی کی کار سے اترے تھے کیسپس کے اس خاموش گوشے میں تم کھڑی ہو گئیں اور کہا۔ "چند منٹ اس سڑک پر ٹھہر لیں۔" پھر تم نے دور بین سنبالی اور مسجد سے ذرا پرے کھیتوں کی جانب کشا کشاں، بوڑھے جوڑوں کو دیکھنے میں محو ہو گئیں۔ میں سگریٹ سلاک کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تم ہر جوڑے کو پہچان کر کنسٹری کر رہی تھیں اور میں تھیں دیکھنے میں مصروف تھا تم کہہ رہی تھیں۔ "وہ دیکھو شاعرہ نے اپنی طویل نظم ایسی زلفیں اپنے دوست کے شانوں پر بکھیر دی ہیں۔" پھر اچانک تم نے دور بین پرے پھینکی اور مجھ سے لپٹ گئیں۔ وہ چند لمحے جیسے پوری کائنات سمٹ کر میری آغوش میں بند رہی۔ تم نے ذرا سا سر اٹھایا اور کہا "کاش ہم پہلے ملے ہوتے۔ میں دنیا کو بتا دیتی کہ پیار کیا ہوتا ہے۔ میں ہانپوں میں ہانپیں ڈال کر آپ کے ساتھ پھرا کرتی۔ اس طرح چھپ چھپ کر کبھی نہ ملتی۔" اور تمہاری آنکھوں سے

آنسو ڈھلک آئے۔

یہ لہو کتنا قیمتی تھا!!!

پھر تم نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑی ہوئیں، میں اس لمحے سورج نے آخری ہلکی لی۔ ڈوبتے سورج کے پس منظر میں تمہارے اُبھرنے کا منظر بہت حسین تھا۔ ہم تم کی پیس کی اس دیران سڑک پر اکٹھے بیٹھتے رہے۔ ہاتھوں میں ہاتھ لیے اور قدم سے قدم ملائے۔ اس وقت خبر ہے مجھے کیا محسوس ہو رہا تھا..... جیسے ہم صدیوں سے یوں ہی ٹہل رہے ہیں۔ جیسے ہم امر ہیں۔ ہر روپ میں آن مٹ..... ہم ہی کائنات۔ ہم ہی اس کے سینے میں چھپا راز اور ہم اس کے متلاشی بھی۔

چلو تمہیں یہ احساس تو ہوا کہ ہماری طرح چھپ کر ملنا، اپنائیت کی تو جین ہے۔ اپنائیت دوسروں کے سامنے اپنانے کا نام ہے۔ دنیا کے سامنے لا تعلق بن جانا ادھورا پیار ہے۔ آج جو باتیں تم نے بتائی تھیں ان پر کسی وقت تفصیل سے بحث ہونی چاہیے اور آخری فیصلہ تمہیں خود کرنا چاہیے۔ میں تو بہت پہلے تمہیں اپنی خواہش سے آگاہ کر چکا ہوں۔ تم غلط سمجھتی ہو کہ خرم خود کشی کر بیٹھے گا۔ بڑے لوگ اپنی موت مرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ دوسروں کے لیے کون مرتا ہے؟ ان کا بس چلے تو وہ آبِ حیات کا گھونٹ لے کر سدا جینے کی آرزو پوری کریں۔ مرنے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے اور اتنا ڈھیر سارا حوصلہ کسی کو مل جائے تو پھر اسے اپنی زندگی کا چراغ گل کرنے کی بھلا کیا ضرورت؟

میں اس بات سے بھی متفق نہیں کہ تم ایک سے بھاگ کر دوسرے کے پاس مگنی تھیں۔ اب اُسے چھوڑ کر تیسرے کے ساتھ جاؤ تو لوگ تمہیں زاہدہ کی طرح بے وفا کہیں گے۔ بھائی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ انسان کسی کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جاتا بلکہ وہ ایک صورت حال سے دوسری میں چلا جاتا ہے۔ مگر ساتھ وہ ہمیشہ اپنے ہی رہتا ہے۔ تم خرم سے وفا کرو گی تو مجھ سے بے وفائی ہوگی اور جانتی ہو، بے وفا کون ہوتے ہیں؟ جو دولت کے لیے انسان کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ زاہدہ ہمیشہ سے اچھی لڑکی تھی۔ اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ لوگوں نے لفظِ وفا سے غلط معانی وابستہ کر رکھے ہیں۔ تم حقیقتوں کو جانو۔ لفظوں سے خوف زدہ کیوں ہوتی پھرتی ہو۔ وفا صرف خرم کے ساتھ رہنے کا نام

نہیں؟ ہاں یہ بات البتہ قابل ذکر ہے کہ خرم سے کیسے بات کی جائے۔ تمہارے گھر والوں سے بات دوسرا مرحلہ ہے۔ تم کہتی ہو کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ خرم تمہیں کوئی الزام دیے بغیر، یا یہ جانے بغیر کہ تم اُس کی بجائے میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو، خاموشی سے تمہیں چھوڑ جائے۔ میں نے جسیں آج بھی بتایا تھا، اب پھر کہتا ہوں کہ میں محبت سے لے کر نفرت تک کسی مقام پر بھی کسی کو دھوکا دینا جائز نہیں سمجھتا۔ خرم تمہیں پیار کرتا ہے نا؟ اُسے کہو کہ شادی کے بعد بھی تم اسے ملتی رہا کرو گی۔ جیسا کہ میں نے جسیں پہلے بھی بتایا تھا میرے لیے اس اذیت ناک صورت کا سامنا کرنا دھوکا دینے کی نسبت آسان ہے۔ میری جان خرم کو طرہ بے سے بتانا ہی ہوگا۔ میں جانتا ہوں یہ کتنا تلخ کام ہے۔ پر زندگی کی خوشیاں انہیں تکلیفوں کے اندر چھپی ہوتی ہیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں، تم کتنی شدید کشاکش کا شکار ہو۔ تمہاری آنکھوں کے ارد گرد سیاہ حلقے اس ذہنی اذیت کا نشان ہیں۔ تم سوچتی ہو، محبت کے بغیر زندگی کا طویل سفر طے نہیں کر سکو گی۔ جب تم دیوی بن کر محبت کی مہکتی فضاؤں میں پہنچتی ہو، اُس لمحے تم سینے پر ہاتھ مار کر مجھے اپنانے کا اعلان کر دیتی ہو۔ (جیسے کل تم مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے مجھے کبھی نہ چھوڑنے کی قسم کھا رہی تھیں) لیکن جوں ہی تمہارے قدم زمین کو چھوتے ہیں، خرم اپنی دولت، بنگلے اور اعلیٰ سماجی رتبے کے زخموں پر سوار ہو کر، دوبارہ تمہارے ذہن کے درجوں پر آن دستک دیتا ہے اور تم پھر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہو۔ تم محبت کی مشاشی بھی ہو اور شاندار زندگی کے خوابوں سے بیدار بھی نہیں ہونا چاہتی۔ (شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، اکثر شرفا کا یہی شیوہ ہے) تم فیصلہ نہیں کر پاتیں کہ کسے چھوڑا دوں کہ کسے رکھوں۔ یہی وجہ ہے کہ تم دو اچھاؤں کے درمیان غولے کھا رہی ہو لیکن میں اور خرم دو متضاد راستے ہیں۔ تم بیک وقت ان دونوں راستوں پر کب تک چل سکو گی؟ کبھی نہ کبھی ایک کو اپنانا اور دوسرے کو چھوڑنا ہوگا۔ تم بار بار کہتی ہو ”آپ کوئی حل سوچیں۔ آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔“ میری جان، تم خرم کو چھوڑنا تو چاہتی ہو لیکن اس ذمہ داری سے بچنا بھی چاہتی ہو۔ تم اپنی ذات کی آزادی سے خوف زدہ ہو۔ تم اپنے آپ سے خوف زدہ ہو۔ اس سارے مسئلے کا حل تمہارے سامنے موجود ہے۔ تم جانتی ہو جسیں کیا کرنا چاہیے۔ لیکن تم مکمل فیصلہ کرنے سے قاصر ہو۔ جب تم یہ کہتی ہو ”آپ ہی کا فیصلہ مجھے قبول ہے“ تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ تم مجھ پر کتنا اعتماد کرتی ہو۔ لیکن میں

صرف اپنے متعلق فیصلہ کر سکتا ہوں۔ میرا فیصلہ تمہارے سامنے ہے۔ لیکن تمہاری جانب سے میں کوئی فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔ یہ فیصلہ تمہیں کرنا چاہیے۔ یہ تمہارا حق ہے۔ میں محبت کے نام پر تمہارا حق اور تمہاری آزادی نہیں چھین سکتا۔ میں محبت کے نام پر، تمہیں فریب سے حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہارے اعتماد کو اپنی خواہش کے تابع نہیں بنانا چاہتا۔ میں تمہیں فتح نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے، میری بات تمہاری سمجھ میں نہ آ سکے۔ جس جہاں میں عورت کو کھیتی سمجھ کر سنبھالنا ہو، وہاں میں اسے انسان بنانا چاہتا ہوں۔

ہو سکتا ہے مجھے اس جرم کی سزا ملے اور تمہارے ہی ہاتھوں ملے۔ ہو سکتا ہے کل تم میری محبت کی بجائے خرم کی دولت کو اپنالو (نہ اند منانا، میں محض امکان کی بات کر رہا ہوں)..... لیکن جو بھی ہو، ہو، ہوتا رہے۔ میں تمہارے اعتماد کو بہانہ بنا کر، تمہیں فریب نہ دے سکوں گا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ ہاں مجھے تمہارے وعدے پر یقین ہے۔ مجھے یقین ہے تم اپنی بات پر قائم رہو گی اور خود کو کبھی فروخت نہ کرو گی۔ تاہم تم خود ان باتوں پر غور کرو، میں بھی سوچتا ہوں، ممکن ہو تو شاید وہ کبھی خط لکھ دو، کوئی حل نکل ہی آئے گا۔

ہاں ابھی امتحان دس اپریل سے شروع ہو رہے ہیں۔ میرا پہلا پیپر سائیکالوجی کا ہے۔ تم کوشش کرو تا میرے امتحانوں تک تو یہیں رہ لو۔ گھر والوں سے کوئی بہانہ لگا لو۔ انہیں لکھ سکتی ہو کہ تمہارا کوئی سیمیٹر باقی ہے۔ یہ بات کیسے ممکن ہو گی تم سات اپریل کو یہاں سے فارغ ہو کر چلی جاؤ اور پھر ۱۲۹ اپریل تک اپنی چھوٹی بہن کو لینے آ سکو۔ ہو سکتا ہے گھر والے تمہیں واپس نہ بھیجیں۔ مجھے پتہ ہے تمہارے گھر والے اب بہت تنگ ہیں۔ تمہیں فوراً واپس بلانا چاہتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم نہیں کہ ان کی صاحبزادی کا واسطہ کن لوگوں سے پڑ گیا ہے؟ تمہارے ڈیڈی پرانے زمانے کی طرح فوج اکٹھی کریں اور پھر کیسپس پر حملہ آور ہوں تب ہی تمہیں یہاں سے چھڑا کر لے جاسکتے ہیں۔ ورنہ سیدھے ہاتھوں تو ہم بھی نہیں جانے دیں گے۔ اب تو خرم صاحب بھی تمہیں یہاں سے فوراً چلے جانے کی تجویز دے رہے ہیں؟ میرا خیال ہے وہ بہت کچھ سمجھ چکا ہے۔ ورنہ وہ کب چاہتا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ میں نے اپنا کمرہ چھوڑ دیا ہے۔ ضیا اقبال کے پاس آ گیا

ہوں۔ وہ کل واپس جا رہا ہے۔ عطی اور میں ہمیں رہ کر امتحان کی تیاری کریں گے۔ میرے کمرے میں تو ہر وقت سیاست کا میدان جمار ہوتا تھا۔ ادھر کوئی کتاب کھولی ادھر کوئی آن دھکا اور جب تنہائی میسر آتی تو تم میرے پہلو میں آن بیٹھتیں۔ عطی ساتھ ہوگا تو شاید کچھ پڑھ سکوں۔ ویسے اللہ ہی حافظ ہے۔ ایمان سے تمہارا سسٹر سٹم اس سے کہیں اچھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جان چھوٹی رہتی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ پورے دو سال بعد میدان جنگ میں اترنا پڑتا ہے۔

ہاں یاد آیا، میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ میں نے جتنے خطوط تمہیں لکھے ہیں انہیں کتاب کی صورت میں شائع کرا دیا جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ دیکھو نا مستقبل کا کیا پتہ، جانے کیا ہو، میں نادم ہوں۔ تمہیں الفاظ کے بغیر کچھ نہ دے سکا۔ میرے ساتھ رہو گی تو بھی تمہیں کیا دے پاؤں گا؟ اور پھر انہیں شائع کرانے میں ہمارا نقصان بھی کیا ہے؟

رات ڈوبی جا رہی ہے..... ذرا منہ قریب لاؤ..... بس

پیار

۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء
لیاقت پال

لڑکی

میں نے واپسی پر خطوط کا پیکٹ کھولا۔ مجھے تو ایک دو خط کم لگتے ہیں۔ تم اپنا پاکس پھر سے دیکھ لینا۔ شاید وہیں ادھر ادھر پڑے ہوں۔ مل جائیں تو چھاپریل کی رات کو ساتھ لیتی آنا۔ رات کے وقت ان سب کو دوبارہ دیکھ لیں گے۔ ویسے تمہاری بات صحیح ہے کہ اگر انہیں شائع کرانا ہے تو پھر اصلی ناموں کے ساتھ ہی ہونے چاہئیں اور ان میں کوئی کانٹ چھانٹ نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے یوں پوچھا تھا کہیں تمہیں اصلی ناموں پر اعتراض نہ ہو ورنہ میں تو سرے سے جعلی قصے لکھنے کا قائل ہی نہیں۔

۱۶ اپریل کو تم نے یہاں سے چلے جانا ہے۔ صرف چار دن باقی ہیں۔ وقت سٹ رہا ہے۔ تمہارے بعد کس قدر تکلیف اور کتنی پریشانیاں ہوں گی! کیا خبر مستقبل کے دامن میں کیا چھپا ہے؟ میرے پاس صرف اندازے ہیں۔ اچھے یا بُرے اندازے۔ میں جو زندگی کو ہمیشہ دلیل کی کسوٹی پر ماپنے کا عادی تھا، آج حیرت زدہ بیٹھا ہوں۔ آج مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے زندگی بھی ایک اندازہ ہے۔ تم یہاں سے جانے کے بعد کبھی مل پاؤ گی؟ صرف اندازہ۔

..... چوکی رات کا پروگرام تو پہلے ہی بن چکا ہے۔ سات کی صبح سویرے سویرے تم واپس آ کر اپنا سامان وغیرہ تیار کر لینا۔ اگر تم ۱۲ بجے تک سب لوگوں سے مل کر فارغ ہو سکو تو ۱۲ بجے سے لے کر ۴ بجے تک آخری چار گھنٹے ہم پھر مل لیں گے۔ تمہاری گاڑی تو سات کی شام کو جائے گی تا.....

خرم چار تا رن تک آجائے گا۔ اس کے ساتھ کسی وقت باہر چلی جانا اور سکون سے اُسے آنے والے وقت کے متعلق بتانا۔ ٹھیک ہے ابھی اُسے میرے متعلق نہ بتاؤ۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ تم اپنے

کزن کے ساتھ زندگی کاٹنے پر مجبور ہو جاؤ..... جانے حالات کون سا رخ اختیار کرتے ہیں؟ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کچھلی دفعہ خاصا مایوس ہو کر گیا تھا۔ لڑکی! میں نے بہت دکھ ہے ہیں، جیسی میں خرم جیسے شخص کو بھی دکھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ اُسے کہتی چانا کہ وہ بھی کبھی انسان بن کر سوچ لیا کرے، تمہیں اُس نے ہمیشہ مقبوضہ کشمیر سمجھا ہے اور جوں ہی تم نے سوچنا چاہا اُس کی طبیعت خراب ہو جاتی رہی۔

اور میں کتنا دیوانہ ہوں، میں اس کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے پاس مفلسی ضرور ہے، لیکن میرا حوصلہ اُس سے زیادہ ہے۔ دیکھو نا، یہ سارا وقت اُس نے تمہارے زانوؤں پر سر رکھ کر گزارا اور میں نے تمہارے آغوش کو ترستے ترستے..... مگر آج تم جانے والی ہو۔ وقت بیت چکا۔ اُس کی خوشیاں دائمی تھیں نہ میرا غم۔ آج ہم دونوں اک نئے موڑ پر ہیں۔ نئی خوشیوں اور نئے غموں کے دورا ہے پر اور میری جان! یہ بھی بیت جائے گا۔ اسی طرح ہم ایک اور نئے موڑ پر پہنچ جائیں گے۔ کسی انجانی ابتدا پر، سکوت، خاموشی اور عدم کے موڑ پر..... جہاں پہنچ کر ہمیں یہ خوشیاں اور غم دونوں ہی بے معانی نظر آئیں گے..... اور جب انہما صرف یہی ہے تو پھر لوگ دوسروں کو دکھ دے کر جانے کیوں خوش ہوتے ہیں؟ خرم تم پر قبضہ بنانا چاہتا ہے۔ تمہارا کزن تم پر فتح کا جھنڈا لہرا رہا چاہتا ہے۔ تو تھ برش سے لے کر انسان تک، لوگ ہر شے کو خریدنے پر ہلند ہیں۔ اپنی خوشیوں کے لیے دوسروں کے گلے پر چھری چلانے سے دریغ نہیں کرتے..... اندھی سوچوں کے مراب میں جھٹکتے ہوئے یہ لوگ اپنی جھوٹی خوشیوں کے لیے انسان کا خون جانے کب سے بہا رہے ہیں۔ بتاؤ نا، سارے لوگ یہ باتیں کیوں نہیں سوچتے؟

میں صاحب کا چھوٹا بھائی تو خاصا سارٹ ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا، جیسے اُس کا موڈ خاصا آف تھا۔ تم بھی کچھ اچھے موڈ میں نہ تھیں۔ کیا اُس سے پھر جھگڑا ہو گیا؟ میرا خیال ہے، خرم اور تمہارے متعلق باتیں اُن لوگوں تک پہنچ چکی ہیں۔

چار کی شام عطی تمہارے جانے کے غم میں سب کو چائے پلا رہا ہے۔ چائے کی شام میرا پروگرام ہے۔ اگر چاہو تو خرم سے بھی کہہ دینا۔ صبیحہ اور عطی تو ہمیں جہیز میں ملے ہیں۔ وہ ہم سے پہلے حاضر ہوں گے۔ سبھی لوگ، کسی اچھے ہوٹل میں چلیں گے۔ آخری موقع ہے، کپ شپ بھی لگ

جائے گی۔ صلی سے پوچھا تھا۔ وہ تو کہتا ہے صبر میں اُسے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ یوں بھی سات بیٹیوں جیسا ایک بیٹا ہے۔ یہ بھاگ دوڑ اُس کے بس کا روگ نہیں۔ عورتوں کو خاوند چاہئیں..... مگر وہ بیٹا ہے۔

ابھی تک ذہن اس بات کو قبول نہیں کر پایا کہ تم واقعی یہاں سے جا رہی ہو۔ تم نہ ہو گی تو کیا میں ان راستوں پر اکیلے بھی چل پاؤں گا؟ تمہارے بغیر جانے کیسے زندہ رہوں گا؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ جانتی ہو میں کتنا حساس ہوں۔ اس ڈکھ نے مجھے لے ڈوبنا ہے۔ پھر اُوپر سے امتحان آگئے ہیں۔ تم کہتی ہو، فرسٹ ڈویژن لوں اور ساتھ ہی مجھے تنہا چھوڑے جا رہی ہو۔ سنو، اگر تاریخ انسانی میں کبھی معجزے ہوئے ہیں تو کیا اب ایک اور نہیں ہو سکتا۔ صرف ایک ایسا کہ تم رک جاؤ اور بس..... تمہارا گفت 'پسند آیا'۔

بہت سادہ

۱۱/اپریل ۱۹۷۳ء

مزنگ لاہور

کنول

اس وقت دن کے کوئی بارہ بجے ہوں گے۔ کمرہ امتحان سے سیدھا میٹیں پہنچا اور اسی سنسناتی مکان میں تنہا بیٹھا تھیں خط لکھ رہا ہوں۔ بشارت وغیرہ ابھی تک واپس نہیں لوٹے اور تھیں یہاں سے گئے آج چوتھا دن ہے۔ یہ میرے سامنے وہی بستر ہے جس پر ہم آخری بار لیٹے تھے۔ اسی طرح شکن آلود، نکیہ چار پائی کے درمیان پڑا ہے اور چادر ایک جانب ڈھلکی ہوئی۔ سگرٹوں کے ککڑے اسی بے ترتیبی سے فرش پر پکھرے پڑے ہیں۔ چار پائی کے نیچے پانی کا آدھا گلاس رکھا ہے۔ اس پر تمہارے لبوں کی سرخی بیوست ہے۔ میں نے یہاں داخل ہوتے ہی گلاس کو ہونٹوں سے لگایا اور پھر بغیر پیئے اسے وہیں رکھ دیا۔ سب کچھ اسی طرح پڑا ہے، جیسے تم یہاں سے ابھی ابھی اٹھ کر باہر نکلے ہو۔ زیادہ سے زیادہ نیچے بیڑھیوں تک پہنچی ہوگی۔ آواز دوں تو فوراً پلٹ آؤ گی۔

اس مختصر سے کمرے میں، میری زندگی کی بہت سی خوشگوار یادیں بند ہیں۔ پہلے دن تم اسی اکلوتی کرسی پر بیٹھی تھیں اور میں تمہارے سامنے بستر پر۔ کتنی دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ تم جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ میں تو اُس لمحے اپنے آپ کو یقین دلارہا تھا کہ واقعی تم ہو اور مجھ سے ملنے آئی ہو اور پھر میں اس حسین حقیقت کے قدموں پر جھک گیا۔ تم پریشان سی ہو کر اٹھ بیٹھیں۔ تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ مجھ سا آدمی کبھی کسی کے پاؤں چوم سکتا ہے۔ یقین جانو، میرا بھی اپنے متعلق یہی خیال تھا۔ مگر انسان کو گرتے کیا درگتی ہے۔

اسی کمرے میں ہم ایک بار لڑے بھی تھے۔ تم مجھے منہ چھپائے روتی رہی تھیں۔ یاد ہے نا، وہ جس والا قصہ؟ میٹیں کئی بار رات کے وقت ہم دونوں نے فرش پر بستر لگایا۔ جانے تمہاری

یہ خواہش کیوں رہتی تھی کہ زمین پر سویا جائے۔ وہ کارنس آج خالی پڑی ہے، جہاں تم آتے ہی اپنا دوپٹا اور دھوپ کی عینک اتار کر رکھا کرتی تھیں۔ تمہاری عادت تھی، جوتے اتارتے ہی شلوار کے کھلے پانچنوں میں اپنے پاؤں چھپا لیتیں، پھر میرے قریب آنے سے قبل ہی تمہاری آنکھیں بند ہو جایا کرتی تھیں۔ جانتی ہو، اس وقت مجھے کیا یاد آ رہا ہے، تمہاری ٹھوڑی کا وہ جل، جسے میں بہت چوما کرتا تھا۔

آج سے صرف چار دن پہلے عین اسی بستر پر تم مجھ سے لپٹی، جنین مار مار کر رو رہی تھیں۔ مجھے اب بھی اس کمرے کے ہر کونے سے سسکیوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں..... میں اس دن زندگی میں پہلی بار رویا تھا، مجھے چپ کراتے کرتے تمہاری سسکیاں اور بلند ہوجاتیں "اب بس کریں نا! اب بس!" آنسوؤں کے بہتے سیلاب میں تم نے یہ بات جانے کتنی بار کہی تھی۔ لیکن شاید میری طرح زندگی میں ایک آدمہ بار رونے والے لوگ اپنے جہنم کے سارے دکھوں پر رویا کرتے ہیں۔ میرے آنسو تمہارے چہرے پر گر رہے تھے۔ تم نے مجھے زور زور سے ہلا کر کہا "خدا کے لیے اب بس کیجئے میں مر جاؤں گی۔ میں آپ کے پاس بہت جلد واپس آ رہی ہوں۔" راجہ صاحب پلیز۔ "یہ کہہ کر تم خود بھی رونا شروع کر دیتیں.....

اوہ خدا یا!..... یہ یادیں! مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا دیوی، میری آنکھوں میں پھر سیلاب اُٹھ آیا ہے، لیکن میرے قریب کوئی نہیں جو مجھے کہے "اب بس کیجئے۔" کوئی نہیں کوئی نہیں..... اس آخری دن تمہارے یہاں سے جانے کے میں منٹ بعد میں نے رکشہ پکڑا اور سینے کے قریب جا اُترا۔ غم اپنی کار میں تمہارے ہاسٹل کی جانب نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ میرا خیال ہے تمہاری امی کی وجہ سے غریب اتنی دور کھڑا تھا۔ تم ہاسٹل کے گیٹ پر اپنی سہیلیوں سے آخری بار گلے مل رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے کی جانب بھاگا کہ تمہیں یہاں سے جاتے ہوئے نہ دیکھ سکوں۔ چار پانی پر گر اور پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

کوئی ٹوبے عطی نے آکر اُٹھایا۔ میں انتہائی تیز بنار میں چل رہا تھا۔ وہ مجھے ڈھنری لے گیا۔ پوری کوشش کے باوجود میری نظر تمہارے کمرے کی جانب اُٹھ گئی، جو میری طرح اداس، تاریک اور تنہا تھا۔ عطی سے آکھ بچا کر میں نے آنسو پونچھے۔ اُسے بھی تمہارے جانے کا بہت دکھ

ہے۔ لیکن اُسے میرے اور تمہارے تعلق کا علم نہیں۔ اُس کا خیال ہے ہم سبھی لوگ آپس میں دوست تھے اور بس۔ اب اُسے بتانا اچھا نہیں لگتا۔ تم واپس آؤ گی تو خود ہی بتا دیتا۔
 آٹھ تاریخ کو میں اور عطی، بکلی سے ذرا پیچھے اپنے مورچے پر شام چھ بجے سے ساڑھے چھ سات تک بیٹھے۔ عطی نے تمہارا پسندیدہ گانا کئی بار گنگنا یا۔ پھر اُس نے ہم سب کی مشترکہ پسند کوئی دس بار گائی۔

آج تنہائی پھر کس ہدم دیریں کی طرح
 کرنے آئی ہے، ساقی گری شام ڈھلے
 منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ بہتاب ابھرے
 اور تراکس جھپکنے لگے ہر سائے تلے

تم اسی جگہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر گنگنا یا کرتی تھیں..... پھر مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے ان غزلوں اور گیتوں میں کوئی نئی بات نہیں۔ ان میں کوئی ایسا حسن نہیں، جس کی بنا پر انھیں یاد رکھا جاسکے۔ ان کی ساری خوبصورتی ان کے ساتھ وابستہ یادیں ہیں۔ ان کے اصل معنی صرف اتنے سے ہیں.....

۹ تاریخ کو تھوڑی بہت پڑھائی ہوتی رہی۔ شام کے وقت مورچے پر آئے۔ صبیحہ اپنی نئی سہیلیوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی گزری۔ ان کے ساتھ یوں قہقہے برسا رہی تھی، جیسے تمہارے جانے کا اُسے ذرا بھی دکھ نہیں۔ مجھے اتنا غصہ آیا۔ پھر سوچا میں بھی پاگل ہوں، چاہتا ہوں ہر کوئی تمہارے غم میں روتا پھرے۔

اتنے میں ناز گزری۔ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بڑے زور سے اُس نے سلام مارا اور عطی سے مذاق کے بہانے چوٹ کرتی ہوئی گزر گئی۔ عطی اپنی جگہ سمجھتا ہے کہ میری پریشانی کا اصل سبب ناز ہے۔ کہہ رہا تھا۔ ”کنول واپس آئے تو میں اُسے ساتھ لے کر تمہارا اور ناز کا راضی نامہ کراؤں گا۔“ میں نے کہا ٹھیک ہے وہ واپس آئے تو اُس سے پوچھ لینا۔ ویسے تازہ خبر یہ ہے کہ (بالکل آج کی) ناز نے نسیم الرحمن کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ خدا ہی اُسے سمجھائے۔

دوسری تازہ خبر سنو! اپنے کمانڈر صاحب بھی ہمارے والی پنچوائشن میں بچھن گئے ہیں۔ سر کو

اُسرا لکوا لیا ہے۔ ذہن ٹھنڈا رکھنے کے لیے دن بھر نہر میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔ لڑکی کا نکاح ہو چکا ہے اور جناب بھی کوڈ پڑے ہیں۔ اب اس کے لیے بھی دعا کرنا تیسری خبر یہ ہے کہ شہلا سعید کی شادی جون میں ہونے والی ہے۔ آج ملی تھی تمہیں بہت یاد کر رہی تھی اور تمہارا پتہ مانگ رہی تھی۔ قاضی صاحب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ آج رات میرے پاس ہی تھے۔ پڑھائی کم اور تمہاری باتیں زیادہ ہوتی رہیں۔ آج کا پہرا اچھا ہو گیا۔ ڈیٹ شیٹ کے مطابق سات مئی کو آخری پرچہ تھا مگر آئین کی وجہ سے ایک دو چٹیاں آگئیں۔ اب آخری پرچہ ۲۱ مئی کو ہوگا۔ تمہارا نام لے کر لکھنا شروع کرتا ہوں ممتحن کچھ تو لاج رکھے ہی گا۔ تمہاری خواہش ہے نا، فرسٹ ڈویژن آئے۔ میں الفاظ کی کوکھ میں نئے معانی بھردوں گا۔ مگر تم خدا کے لیے اپنے کبے پر قائم رہنا اور یہ نہ سوچنا تم ۱۲۹ اپریل کو واپس آگئیں تو میری پڑھائی کا حرج ہوگا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہونے کے لیے باقی بچا ہی کیا ہے؟ اب تو کوئی سانس ایسی نہیں آتی جس میں تمہاری یادیں موجود نہ ہوں۔ کوئی لکھا یا نہیں گزرتا، جس میں میری سسکیوں کی آواز شامل نہ ہو۔

تم اپنے گھر میں حالات ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا، تاکہ بات شروع کرائی جاسکے۔ میں اپنے گھر خط لکھ دوں گا۔ لیکن پہلے تمہارا پتہ چلے۔ میرا خیال ہے آج کل ہی تمہارا خط آجائے گا۔ قلم و حل گئی ہے۔ صرف چار پانچ فوٹو اچھے آئے، باقی خراب نکلے ہیں۔ تمہارا ایک فوٹو تو بہت ہی آفاقی قسم کا ہے، جس میں تم میری چادر لپیٹے شاہ جی والے سینما کی گیلری میں کھڑی ہو۔ وہ اس خط کے ساتھ ہی بھیج رہا ہوں۔ قاضی صاحب نے اس کے پیچھے ایک عنوان لکھ دیا ہے۔

رانجھن رانجھن کر دی، میں تے آپے رانجھا ہوئی

اُن کا خیال ہے، تمہیں یہ عنوان پسند آئے گا۔ سعیدہ اور بوڑھی اُستانی والا فوٹو بھی ٹھیک آیا ہے۔ یہاں آؤ گی تو دیکھ لینا میں نے تمہارے لیے علیحدہ سے کاپیاں بنوائی ہیں۔

بہت ساریا

تمہارا ہمیشہ

۱۴ اپریل ۱۹۷۳ء

انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

سلام!

اپنی پوجل پکوں کو دنیا کی نظروں سے چھپانے میں آٹھ تاریخ کی شام، اپنے گھر واپس پہنچی۔ خط دیر سے لکھنے کی معافی چاہتی ہوں۔ کیا کرتی۔ ابھی تک سکھ کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ گھر کو فضا انتہائی بور ہے۔ اس گھٹے گھٹے ماحول کو اپنانے کے لیے بھی تو ایک عرصہ چاہیے۔

سنائیے آپ کی جانب صورت حال کیسی ہے؟؟؟ اب تک ایک ہیپر ہو چکا ہوگا۔ کیا ہوا؟ میں سمجھتی ہوں میں آپ کی مجرم ہوں۔ میری وجہ سے آپ بالکل نہیں پڑھ سکے۔ ذرا بھی تو تیاری نہیں تھی۔ خدا (جیسے آپ لاشعوری طور پر مانتے ہیں) سے میری دعا ہے وہ آپ کو کامیاب و کامران کرے۔ ورنہ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکو گی۔

شٹی (مجھ سے چھوٹی والی) کسی سٹی کی شادی میں شریک ہونے کے لیے کل صبح لاہور جا رہی ہے۔ میں یہ خط انہی کے ہاتھ بھجوا رہی ہوں۔ وہ لاہور سے پوسٹ کرے گی۔ ویسے حیران ہو رہی تھی کہ مجھے یہاں پہنچتے ہی آپ کو خط لکھنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟

یوں تو آپ سے واقف ہے مگر میں نے ابھی اُسے کچھ نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے وہ خود ہی اندازہ لگا لے گی۔ مگر میں کسی کو نہیں بتا سکی کہ میرے مسٹر میں سے ایک ہیپر باقی رہتا ہے۔ گھر والوں سے کیسے بات کروں۔ تین سال یونیورسٹی میں رہی، پھر بھی کورس مکمل نہ کر سکی۔ مجھے بتائیے اس سلسلے میں کیا کروں؟ آپ استخوانوں میں بہت معروف ہوں گے۔ لیکن چند منٹ نکال کر میرے ڈیپارٹمنٹ میں جا سکیں تو شیخ صاحب سے معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ پتہ کرادیں، اس ہیپر کی کلاسیں کب سے شروع ہو رہی ہیں۔ مضمون کا نام ہے ”پاکستان میں تعلیم“۔

سنا ہے اب تک دل کچھ لگا ہے یا نہیں۔ میں محسوس کر سکتی ہوں آپ کس قدر پریشان ہوں گے۔ کاش میں آپ کے قریب ہوتی! ویسے حالت اپنی بھی بہت بُری ہے۔ یہاں ابھی تک سکوت مرگ ایسی خاموشی ہے۔ جو آنے والے کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میں ایک ایسے آتش فشاں پر کھڑی ہوں جس کا دہانہ کسی لمحے بھی پھٹ سکتا ہے۔ آنکھیں بند کیے ہر وقت خدا سے دعا مانگتی رہتی ہوں۔ میری خالہ بہت چکر لگا رہی ہیں۔ ایک دن اُن کا بیٹا بھی ساتھ آیا تھا۔ اُس آدمی کی آنکھوں سے اجنبی قسم کی چمک پھونکنے دیکھ کر میں تو کانپ ہی گئی۔ شاید، وہ پہلا مرد ہے، جسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ ورنہ آپ جانتے ہی ہیں۔

لاہور بہت یاد آتا ہے خاص کر نیو کیپس کی شام، جب ہم لوگ اکٹھے پھرا کرتے تھے۔ جانتی ہوں، ماضی کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے کچھ حاصل نہیں، لیکن کیا کروں میری بہت سی قیمتی یادیں اور اصول دن ماضی کی تہوں میں کھو گئے ہیں۔ اس خزانے کو میں کیوں کر بھلا دوں؟ اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔ خط لکھنے سے پہلے میں آپ کی جیل والی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ابھی بھی میرے جیسے کے نیچے رکھی ہے۔ اپنے کمرے میں اکیلی ہوں۔ جانتے ہیں، کون سے کپڑے پہن رکھے ہیں۔..... آپ والے.....

آپ مجھ سے بہت دُور ہیں۔ لیکن یہ کپڑے پہن کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے آپ میرا لباس پہن کر میرے قریب ہوں اور میرے دل کی دھڑکنوں کو کان لگا کر سن رہے ہوں۔ اودھ خدایا! آپ کتنے یاد آ رہے ہیں۔

میں جس بات کا اظہار نہ کر سکی، آج میں اُس کا کھل کر اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔ نیٹے راجہ صاحب! میں آپ سے پیار کرتی ہوں۔ بہت ہی زیادہ پیار کرتی ہوں۔ مجھے کچھ علم نہیں کل کیا ہوگا؟ لیکن میرا پیار ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ میرے اس اعتراف کو کبھی فراموش نہ کیجئے گا۔ اجازت دیجئے۔

ذہیروں پیار

صرف آپ کی کنول

۱۹ اپریل ۱۹۷۳ء

انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

سلام!

آج شام ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ کچھ کچھ ہم سی پکواکشن پیدا ہو گئی۔ یقین کیجئے، میں اپنے آپ کو سنہال نہ سکی۔ سسکیوں کی آوازیں کراہی دوڑتی ہوئی پہنچیں۔ سبھی لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اور پوچھنے لگے ”کیا ہو رہا ہے، کہیے نا.....“ انھیں کیا بتاتی؟

کل رات ہم لوگ اپنے کچھ رشتہ داروں کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ ٹی وی پر طارق عزیز موسیقی کا کوئی پروگرام پیش کر رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ سارا منظر پھیل گیا جب ہم شوٹنگ دیکھنے اُس کے سیٹ پر گئے تھے۔ یاد ہے اُس نے شعر سنایا تھا۔

جو ہو یا ایہہ ہونا ای سی، تے ہوتی ہونیوں رکدی نہیں

اک واری شروع ہو جائے، تے گل فیرا یو یں مکدی نہیں

کہاں ختم ہوتی ہے پھر! انسان اپنی سوچوں کا محتاج بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے اس ہنسی بستی محفل میں بڑی مشکل سے بھینکتی آنکھیں خشک کیں، سبھی لوگ میرے درد سے بے خبر ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ دعوت پر میرے کئی کزن موجود تھے۔ ان میں سے ایک دو گورڈن کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ باتوں میں یونیورسٹی پائیکس کا ذکر چلا، کسی نے فوراً آپ کا نام لیا۔ یہاں پر موجود سبھی لوگ آپ کو جانتے تھے۔ پھر آپ کے مستقبل پر بحث شروع ہو گئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ ”وہ تعلیم کے لیے باہر جا رہے ہیں۔“ ایک لڑکا تو آپ کا بہت معترف لگتا تھا۔ کہنے لگا ”وہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔ وہ انتہائی ذہین بھی ہے اور بہت اچھا مقرر بھی۔“ میں نے دل ہی میں کہا ”نادان لڑکے! مجھ سے پوچھو کہتے پیارے مقرر ہیں۔“ جب یہ سارے لوگ آپ کی تعریف کر رہے تھے تو میں

اتنی خوش تھی کیا بتاؤں..... میں نے سوچا انھیں کیا پتہ، وہ جس شخص کی باتیں کر رہے ہیں، وہ تو خود یہاں بیٹھا ہے میرے دل کے اندر۔

میری شادی کے متعلق تیز اور نوکیلی سانسوں کی آواز میں سرگوشیاں جاری ہیں تاہم مجھے دیکھتے ہی بات پلٹ دی جاتی ہے۔ میری خالہ زاد بہن نے ایک دن مجھ سے پوچھا، ”تعلیم تو ہو چکی اب آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟“ میں نے کہا ”ایک سال تک آرام کرنا چاہتی ہوں پورا ایک سال۔“ یہاں سے نجات کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں وقتی طور پر کہیں ملازمت کر لیتی۔ مگر مجبور ہوں۔ کاش میں نے اپنا کورس ہی مکمل کر لیا ہوتا اس عالم میں ملازمت کے متعلق سوچنا ہی بے کار ہے۔ یہاں موسم بہت خوشگوار ہے۔ اس وقت بھی بارہنگی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ لاہور تو میرے ذہن کی مانند جل رہا ہوگا۔ مگر موسم بھی جیسی اچھے لگتے ہیں، جب آدمی کا اپنا ذہن مطمئن ہو۔ میں اس خوشگوار فضا کو کیا کروں جہاں میں کونسل کی طرح دھک رہی ہوں۔ پھر مجھے دن بھر ایکٹنگ کرنا پڑتی ہے کہ میں اس جگہ واپس آ کر بہت خوش ہوں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں وغیرہ وغیرہ۔ بعض اوقات مجھے انتہائی پریشان حالت میں بھی یہی بہروپ بھرنا پڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک دن چلا چلا کر انھیں بتاؤں ”میں بہت اُداس ہوں۔“

کل رات میں نے خواب دیکھا۔ آپ میرے پاس لیٹے تھے۔ صبح جاگی تو محسوس ہوا جیسے آپ واقعی یہاں آئے ہوں۔ بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے..... بالکل حقیقت جیسا خواب تھا۔ میں کافی دیر تک آنکھیں بند کیے سوچتی رہی۔ میں بار بار اسی نتیجے پر پہنچی کہ آپ سے بڑھ کر مجھے کوئی عزیز نہیں ہے۔ آپ نے مجھے زندگی کی گہرائیوں سے بلا دیا ہے، کوئی یہاں تک نہ پہنچ سکے گا۔

میں کتنی مضبوط دل عورت تھی۔ لیکن حالات نے میرے تین حصے کر دیئے ہیں۔ ایک جانب میرا خاندان، ماں باپ اور میرا مگنیتیر ہے۔ دوسری جانب خرم، جس کا میرا انکی سالوں کا ساتھ ہے اور تیسری جانب ایک ایسا شخص ہے، جس کے ساتھ میری قربت کی داستان اتنی طویل تو نہیں مگر یوں لگتا ہے جیسے صدیوں سے اُسی کی منتظر تھی۔ وہ مجھے مشکل کے بعد ملا ہے اور اُسے حاصل کرنا شاید اس سے بھی زیادہ مشکل ہو..... اس لیے کہ وہ دنیا والوں کے معیار سے بہت آگے ہے۔ کاش وہ اتنا آگے نہ ہوتا، یا پھر میں اتنا پیچھے نہ ہوتی..... ہاں لیکن پھر وہ ”وہ“ کیسے ہوتا؟

آپ کے ساتھ رہ کر مجھے بھی فلسفے کا دورہ پڑ گیا ہے۔ دیکھ لیجئے، محبت کا اثر ہے۔ راجہ صاحب! میں اپنے آپ کو جوڑنا چاہتی ہوں۔ میں ایک ہونے کے لیے جنگ کر رہی ہوں۔ دعا کیجئے، میں کامیاب ہو سکوں۔ میں اپنے بے وجود کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے آپ کی باتیں اب یاد آتی ہیں۔ آپ مستقبل سے باخبر تھے، جیسی اتنے کھوئے کھوئے رہتے تھے۔ میں بے خبر کیسپس کی شاہراہوں پر زندگی ڈھونڈتی پھری۔ مجھے احساس ہے، ان ساری جگہوں سے اکیلے گزرنا آسان نہیں، جہاں کبھی ہم آپ بیٹھا کرتے تھے۔ شاہ جی والا سینما تو ایسی جگہ ہے، جہاں بہت سے حسین لمحات گزرے ہیں۔ بھلا میں اُس صوفے اور کمرے کو کیوں کر بھلا سکتی ہوں؟ آپ اس قدر جذباتی باتیں لکھتے ہیں، جو مجھے بار بار زلا دیتی ہیں اور یہاں کوئی نہیں، جس سے یہ سب کچھ دہرا کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔ شام کے وقت مورچہ باقاعدگی سے جتا ہوگا؟ مٹھی صاحب کے کیا حال ہیں؟ صبیحہ وغیرہ کو سلام کہہ دیں۔ آپ کے خط باقاعدگی سے مل رہے ہیں۔ یہاں سے کیجئے وقت مجھے ذرا پریشانی ہوتی ہے۔ بوائز ہاسٹل کی بجائے آپ کے ڈیپارٹمنٹ کا پتہ پر خط لکھ دوں، تو میرے لیے آسانی ہو جائے گی۔ آپ بُراندہ مٹائیں تو لفافے پر انجم راجہ، کے نام سے پتہ لکھ دیا کروں۔ مجھے دوسروں کے ہاتھ خط پوسٹ کروانا پڑتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی اسے کھول کر پڑھتا پھرے۔ پوسٹ مین سے کہہ دیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ میں پروگرام کے مطابق اپریل کے آخر یا مئی کے پہلے ہفتے میں لاہور آؤں گی۔ ابھی تک ڈیٹ فکس نہیں ہوئی۔ شاید ای بھی ساتھ ہوں۔ مگر میں نے کیسپس ہی میں ٹھہرنا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ دیکھئے اب تو میں شگ خط نہیں لکھتی۔ اُمید ہے آپ کو یہ شکایت نہ ہوگی۔ خرم کو بھی آپ کے ساتھ ہی خط لکھ رہی ہوں۔ (نہ اندہ منائے گا) شاید اُس کی ٹرانسفر جلد ہی راولپنڈی ہو جائے۔

ڈھیرول پیار

ہمیشہ آپ کی

۱۲۲ اپریل ۱۹۷۳ء
انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

اودھایا! میں کتنی تنہا ہوں اور کس قدر مایوس بھی۔ تاریک رات..... خاموش ہوا..... اور گہرا سکوت، یوں لگتا ہے جیسے گردشِ دوراں ساری کائنات سمیت عدم کی پہنائیوں میں گم ہو گئی ہو۔ لیکن میری رُوح چٹکوں پر اٹکے آنسو کی مانند بے چین ہے۔ ادھوری تمنائیں، مجبور خواہشیں اور روتی آرزوئیں۔ جنم جنم کی کوئی ایسی بھوک میرے اندر کروٹیں لے رہی ہے، جسے جاننے سے میں قاصر ہوں۔

یوں تو میں تنہا ہوں، لیکن حسین یادیں میرے پہلو میں لپٹی ہیں۔ میرے حواس پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ اُف ایہ یادیں بھی تو اندھے کنوئیں ہیں، جن میں مگرنے والے کبھی دھبہ نہیں پہنچ پاتے۔ یا پھر کسی سچ بستہ صبح کے آخری خواب کی طرح ہیں، جسے دیکھنے والے بیدار نہیں ہونا چاہتے۔ میری آنکھیں یادوں کے بوجھ تلے بند ہوئی جاتی ہیں۔ سوچتی ہوں وہ لمحات جو یادیں جنم دیا کرتے ہیں، جانے پھر کب لوٹیں۔

بکھرے خیالوں کی رنگین دنیا میں بار بار کھو جاتی ہوں۔ کہیں دُور سے پیار کی زندہ لہریں دھمے دھمے تال پر پھوٹ رہی ہیں۔ میں جیسے ان آوازوں کے سحر میں محذور اور مدہوش ہو جاتی ہوں۔ میں آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہوں۔ پھر اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اکیلی ہوں، میرے ارد گرد سکوت، اندھیرا اور پیاس! کوئی دوست کوئی دشمن میرے قریب نہیں..... ہاں مگر تنہائی اور یادیں۔

آپ تو میری سوچوں کے حکمران ہیں۔ آپ نے مجھے پیار کے حیاتِ آفرین لمس سے آشنا کیا ہے۔ آپ کی گہری باتیں، دوستانہ مشورے، خوبصورت الفاظ اور پیار میرے وجود کا حصہ بن گئے

ہیں۔ آپ کا غم زدہ چہرہ میری ذات کی گہرائیوں میں محفوظ ہے۔ آپ نے مجھے اتنا کچھ دیا۔ لاکھ چاہوں تو بھی لوٹا نہیں سکتی۔ میں خوش نصیب تھی، آپ جیسے انسان نے میری قدر کی اور پھر مجھے خیال آتا ہے، خوشیاں کتنی جلد اندھروں میں بھٹک جاتی ہیں۔ سب کچھ بیت گیا ہے اور میرے پاس صرف یادیں رہ گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کسی دن کسی موڑ پر ہم ضرور اکٹھے ہوں گے۔ دل کے رستے زخم ایک نہ ایک دن مندرمل ہوں گے۔

تب تک کے لیے ڈھیروں پیار

کنول آپ کی

۲۶ اپریل ۱۹۷۳ء

راجہ صاحب

سلام!

آج آپ کے چار خط ملے۔ تین نئے ایڈریس پر تھے اور چوتھا میرے پرانے پتے پر۔ پلیز مجھے فوراً لکھئے نئے پتے پر آپ نے کتنے خط بھیجے ہیں۔ دو خط کھلے ہوئے ملے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کئی لوگوں نے انھیں پڑھا ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی، پھر بھی آئندہ کے لیے احتیاط کر لینی چاہیے۔ یوں کریں لٹافے پر شفی کا نام کچھ نکل حروف میں لکھ دیا کریں اور اندر میرے نام کی بجائے صرف، ہیلو کا کافی ہے اور دوسری ضروری بات، ایڈریس انگریزی میں لکھا کریں۔ آپ کی لکھائی یہاں سب لوگ پہچان لیتے ہیں۔ یوں بھی خاصی مردانہ لکھائی ہے۔ سبھی کو شک ہوتا ہوگا۔ خاص کر خرم کے متعلق تو بہت سی افواہیں یہاں گھوم رہی ہیں۔ (آپ کے بارے میں صرف شفی کو علم ہے) میرا خیال ہے آپ کے خطوں کو جیسی وہ کھولنے کے درپے رہتے ہیں۔ سوچتے ہوں گے، خرم کے خط ہیں۔

میں اس خالہ کا کیا کروں، ہر وقت میری امی کے کان بھرتی رہتی ہے۔ اُس نے جیسے لاہور کی ساری باتوں کا ریکارڈ رکھا ہوا ہے۔ امی کو یہاں تک بتایا ہے ”تمھاری بیٹی، فلاں دن لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ رات گئے تک باہر پھرتی رہی۔ فلاں روز قلم پر گئی۔“ امی یہ سب کچھ سن کر مجھ سے ناراض سی رہتی ہیں۔ پہلے پہل ڈیڈی ٹھیک تھے، لیکن اب ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے، جیسے ان تک یہ معلومات پہنچائی جا رہی ہیں۔

ایک دن ڈیڈی کہہ رہے تھے ”تعلیمی اداروں کی فضا بہت گندی ہے۔ طلباء پڑھنے کی بجائے آوارہ گردی کرتے ہیں۔ دہریت کی باتیں کھلے عام ہو گئی ہیں۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو ’سوشلسٹ‘ کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے بچنا ہی چاہیے۔“ میں تو حیران ہی رہ گئی۔ جیسے

کسی نے خاص طور پر آپ کے متعلق بتایا ہے۔ پہلے انہوں نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ رہے صاحب آپ ٹھیک کہا کرتے تھے، واقعی ان لوگوں کے ذہن پر خاندان، بڑائی، عزت اور وقار کی جھوٹی باتیں قبضہ جمائے بیٹھی ہیں۔ یہاں سوائے پیار کے ہر شے جائز ہے۔ محسوس کرتی ہوں، جیسے میں کسی غلط جگہ پیدا ہو گئی ہوں۔ اپنے ناموس کی خاطر اپنی اولاد کو ذبح کر دینا، یہاں کا دستور ہے۔ میں ایک ناقول عورت! ان سے کیسے لڑوں گی اور کب تک؟ میں تو یہی سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جاتی ہوں۔ میرے پاس دعا اور انتظار کے سوا کچھ ہی کیا ہے۔

شکر ہے آپ کے تین بچے راجھے ہو گئے۔ چوتھے کی خوب تیاری کریں۔ آپ کی بڑی ہمت ہے۔ خدا کے لیے ڈھیلا نہ پڑیے گا۔ یہ کیا باہر جانے کا پروگرام کیوں ترک کر دیا؟ آپ کو میری قسم اس طرح نہ کریں۔ بہت ممکن ہے آپ کے باہر جانے سے کوئی بہتر صورت پیدا ہو جائے۔ آپ میرے لیے گفٹ کیوں خریدتے رہتے ہیں؟ مجھے آپ کے سوا کسی چیز کی کمی نہیں۔ پھر پیسے فضول بھینکنے سے فائدہ؟ کیوں بار بار مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ نے مجھ سے صرف ایک گفٹ لیا اور وہ بھی سادہ سے اسٹنڈ۔ کوئی اور چیز دوں، آپ لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بتا رہی ہوں، اب میں نے کوئی گفٹ نہیں لینا۔ پلیز ناراض مت ہوں۔

عطی صاحب کو کتے نے کاٹ کھایا تو آپ فوراً اس غریب کتے کو تلاش کریں یا ورنہ ہو گیا ہو ورنہ میری طرف سے اس کو پوچھ دیجئے گا۔

ڈھیروں پیار

آپ کی کنول

۱۲۹ اپریل ۱۹۷۳ء

انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

غضب ہو گیا اچھے پہلے ہی پڑ تھا، ایک نہ ایک دن یہی ہوتا ہے۔ کل آپ کا خط جانے کیسے ڈیڈی کے ہاتھ لگ گیا..... آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، اس کے بعد کیا قیامت آئی ہوگی؟ انھوں نے فوراً می کو بلایا اور خط اُن کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا "یہ سب کیا ہے۔" امی کے منہ سے نکل گیا "یہ کسی لڑکے کی شیطانی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے دو خط میں نے دیکھے ہیں۔" ڈیڈی نے کہا، "وہ خط بھی فوراً لاؤ۔" میں مجبوراً آٹھی اور انھیں خط دے دیے۔ (یہ وہی دونوں خط تھے جو مجھے کھلے ہوئے ملے تھے۔ شاید امی نے انھیں پڑھا تھا) ایک خط میں آپ نے میرے کورس کے متعلق تفصیلات بھیجی تھیں اور مجھے فارم پُر کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے کہہ دیا "فارن سکا لرشپ کے لیے یہ کورس ضروری ہوتا ہے۔ میرے ایک کلاس فیلو نے مجھے اس کی اطلاع کے لیے خط لکھا ہے۔" انھوں نے پوچھا "اس لڑکے کا نام؟" میرے منہ سے نعیم نکل گیا۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے "میں تمہارے ہیڈ کوارٹس لڑکے کے متعلق لکھ رہا ہوں کہ اس نے یہ حرکت کی ہے۔" خدا کے لیے ان کی چشمی وہاں تک نہ پہنچنے دیں۔ وہ نعیم غریب خواہ مخواہ مارا جائے گا۔

ڈیڈی تو غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ مجھے ڈانٹتے ہوئے کہنے لگے "تم نے لڑکے کو اس قسم کے ذلیل خط لکھنے کی اجازت کیوں دی؟" ایک خط میں شفی کا ذکر بھی تھا۔ وہ غریب خواہ مخواہ ماری گئی، دیکھیے نا؟ اس کا کیا تصور؟

شفی کو بھی بہت ڈانٹ پڑی۔ مجھ سے اتنی ناراض ہو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی "تم خرم کی وجہ سے پہلے ہی سستی پریشان تھیں، اوپر سے تم نے ایک اور سلسلہ بھی چلا دیا۔ اب خراب ہوتی رہو۔" وہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ یا تو اس وقت پاگل تھی اور اگر نہیں تھی تو اب ضرور ہو جاؤں گی۔ کاش میں

کیسپس نہ گئی ہوتی! مجھے اپنے لیے کوئی راہ نہیں چننی چاہیے تھی۔ 'فرماں بردار' بیٹی کی طرح مجھے کچھ نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ میں بہت پریشان ہوں۔

ان حالات میں میرا لاہور آنا ممکن نہیں رہا ہے۔ شاید ڈیڈی ہی آجائیں گے۔ آپ مجھے خط نہ لکھیے۔ اگر کسی کے ہاتھ پھر آگیا تو میں زندہ رہنے کے قابل نہ رہ سکوں گی۔ جب بھی ممکن ہوا میں آپ کو لکھتی رہا کروں گی۔ خط دیر سے آئے تو بھی پریشان نہ ہوں۔ یاد رکھیں آپ کو ہر حال میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنی ہے۔

ڈھیروں پیار

کنول

۱۲ جون ۱۹۷۳ء
انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

سلام!

آپ کو کبھی ایک زمانہ بیت گیا۔ کبھی کبھار آپ کی خیریت کی اطلاع ملتی رہی۔ صبیحہ کا ایک خط آیا تھا۔ پتہ چلا آپ شدید بیمار ہیں۔ میں بہت فکر مند رہی۔ کوئی ہفتہ بھر پہلے میری سیکلی ساروہ اپنے خاوند کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ (دونوں اپنی مون کے لیے جاتے ہوئے ہمارے پاس ایک رات کے لیے ٹھہرے تھے۔) اُس نے بتایا آپ کیسے ٹھیرا کے ایک گونے میں بیٹھے جائے پئی رہے تھے۔ آپ جائے پر بیٹھے تھے، تو جان لیا کہ ابھی تک زندہ ہیں۔ میں نے آپ کی صحت یابی کے لیے بہت دعائیں مانگیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

آپ کے خط ہی تو میرا بہترین سرمایہ تھے۔ اب نہیں آتے، تو مجھے زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ مجبوری بھی کیا ظالم شے ہے، وہی چیز چھین لیتی ہے..... جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہو۔

وہ خط والے قصے کا اب پتہ چل گیا ہے۔ آپ کا خط ایک منصوبے کے تحت ڈیڑی تک پہنچایا گیا تھا۔ یہ سب جلا تک میری چھوٹی خالہ نے کی۔ امی اور بڑی خالہ بھی اس نیک کام میں اپنی بہن کے ساتھ شامل تھیں۔ مجھ سے پہلے بھی ان لوگوں نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی کا فیئر اسی طرح ناکام کرایا تھا۔ اُس لڑکی کی شادی اپنے ایک کزن کے ساتھ کروادی تھی..... اور اب ’وہی لڑکی‘ ہر عورت سے اپنی ناکامی کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ جانتے ہیں وہ لڑکی کون تھی؟ یہی میری چھوٹی خالہ!

ان لوگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ اس طرح مجھے ڈیڑی کی نظروں میں زسوا کر دیا جائے، تو وہ

میری شادی فوراً میرے کزن سے کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ بلکہ اُنے احسان مند ہوں گے کہ اُن کی 'خراب' بیٹی بھی ٹھکانے لگ گئی ہے۔ اس حد تک اُن کا پلان کامیاب ہو گیا ہے کہ ڈیڑی اور ہم بہنوں کے درمیان نفرتوں کی تلخ حائل ہو چکی ہے۔

ڈیڑی پرانی وضع کے آدمی ہیں، انھیں اس بات کا بہت صدمہ پہنچا ہے۔ اُن کی آنکھیں زمین کو لگ گئی ہیں۔ ہر وقت سوچوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ میں سوائے شفی کے کسی سے بات نہیں کرتی۔ یوں لگتا ہے، جیسے اس گھر میں اجنبی ہوں۔ باہر آنا جانا بالکل بند کر دیا ہے۔ اتنی بدل گئی ہوں، آپ بھی شاید پہچان نہ سکیں۔ شفی کا خدا بھلا کرے، وہ نہ ہوتی تو میں زندہ نہ بچتی۔

اب ماضی پر غور کرتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ غلطی میری تھی۔ مجھے آپ سے وعدے نہیں کرنے چاہئیں تھے۔ میں تین پارچم لوں تو بھی اس گھر کے لوگوں کو وہ باتیں نہیں سمجھا سکتی۔ جو آپ سوچتے یا کرتے ہیں۔ فرض کیجئے میری مشکلی ٹوٹ بھی گئی، تو ان لوگوں کا پہلا سوال ہوگا "لڑکا کس عہدے پر ہے؟"

آپ کو بھلانا آسان نہیں۔ میں المیہ گیت سن سکتی ہوں، کوئی ایسا ناول پڑھ سکتی ہوں اور نہ ٹرچیک فلم دیکھ سکتی ہوں۔ راتوں کو سوتے ہوئے کانپ کر بیدار ہو جاتی ہوں۔ مجھے میرا ضمیر چین نہیں لینے دیتا۔ میں نے آپ کو ختم کر دیا ہے۔ ایک ایسے انسان کو جلا دیا، جس نے مجھ پر بہت احسان کیے تھے۔ تاہم تقدیر سے کیا ٹھکرو؟ وہ کسی نے کہا ہے "آئیڈیل ایک ایسی منزل ہے، جس پر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔" آپ میرا 'آئیڈیل' ہیں۔ شاید میں آپ تک کبھی نہ پہنچ سکوں۔

مجھے صرف ایک خط لکھیے اور بس۔ اپنا مستقل پتہ ضرور لکھیے۔ (اگرچہ بے فائدہ) آئندہ کا پروگرام۔ (بے فائدہ) لاہور کب تک رہنے کا پروگرام ہے (پھر بے فائدہ).....

مجھے پتہ چلا ہے آپ کسی لڑکی کے ساتھ بہت پھرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی آپ 'اُس لڑکی' کے ساتھ پھریں۔ ہو سکتا ہے میں یہ بات رقابت کے تحت کہہ رہی ہوں۔ میں آپ پر اپنا حق جتا رہی

ہوں۔ میں تو جیسے نفسیاتی مریض بن گئی ہوں۔ آپ اور میں اب دو مختلف انسان ہیں۔ (کتنا تکلیف دہ تصور ہے)
میں ہار گئی ہوں، مجھے معاف کر دیجئے گا۔

آخری بار بہت سادہ

کنول

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

۱۱۵ اگست ۱۹۷۳ء

انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

اگر میرا ماموں زاد بھائی راولپنڈی سے بھاگا بھاگا میرے پاس نہ آیا ہوتا، تو میں یہ خط نہ لکھتی۔ پرسوں کہیں وہ آپ سے ملا اور پھر سیدھا میرے پاس پہنچا۔ اُس نے آتے ہی تقریر شروع کر دی ”تم نے دھوکا دیا ہے۔ تم نے ظلم کیا ہے۔ تم بے حس ہو۔ تم نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔“ آپ تو جانتے ہیں وہ آپ کا کتنا فدائی ہے۔ اندازہ کر لیجئے کہ اُس نے مجھے کیا کچھ نہیں کہا ہوگا؟ تاہم میں نے اُس کے سامنے کچھ بھی تسلیم نہیں کیا۔ میں نے کہا، ”میرا آپ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ عام جان پہچان تھی۔ الیکشن وغیرہ میں اکٹھے کام کیا۔ شاید آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔“ میں نے اُسے بتایا کہ پاکستانی لڑکوں کی نفسیات ہی خراب ہے۔ ذرا سی ہنس کر بات کرو، وہیں عاشق ہو جاتے ہیں۔ جب وہ یہ سب کچھ آپ کو بتائے گا، تو آپ کو کتنی تکلیف ہوگی! خدا کرے اُس کے ملنے سے قبل میرا یہ خط آپ تک پہنچ جائے۔

اُس نے مجھے بتایا، آپ پہلے سے بھی بہت ڈبلے ہو گئے ہیں۔ اللہ، آپ پہلے ہی کتنے ڈبلے تھے! اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟ سگریٹ کم پیا کریں، چائے چھوڑ دیں، رات کو جلدی سو جایا کریں، کھانا وقت پر کھایا کریں۔

زندگی حوادث کا مجموعہ ہے۔ ایک حادثہ تھا کہ ہم ملے اور ایک حادثہ ہے کہ چھڑ گئے۔ بعض اوقات انسان جو کام نہی کھیل میں شروع کرتا ہے، تقدیر اُس کے انجام پر انسان کو اکثر زلا دیتی ہے۔ ہماری کہانی کی یہی ابتدا تھی اور یہی اس کا انجام۔

میں نے وہی کچھ کیا، جو ان حالات میں ممکن تھا۔ تقدیر ہمیں مختلف راہوں کا مسافر بنا چکی ہے، لیکن یہ ساری باتیں دہرا کر میں آپ کو اور پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ آپ مجھے بھلانے کی

کوشش کیجئے، اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں..... لیکن خدا را اپنے آپ کو جاہ نہ کیجئے۔ کیا ہم پہلے ہی بہت رُسوا نہیں ہو چکے؟ میری دعا ہے خدا آپ کو سکون دے اور آپ کا مستقبل بہتر بنائے۔ میں جانتی ہوں آپ میں کتنی قوت برداشت اور کتنا حوصلہ ہے۔ آپ کو یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیے۔

میں ایک بار پھر آپ سے معافی کی درخواست کرتی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ غلطی میری تھی..... میں نے آپ سے وہ وعدے کیے، جنہیں میں نہ بھاسکی۔ میں نے آپ کو..... وہ امیدیں دلائیں، جن پر میں خود پوری نہ اتر سکی..... لیکن جو ہونا تھا، وہ ہو چکا اب ان باتوں سے کیا حاصل؟

پلیز اس خط کا جواب نہ دیجئے گا.....

کنول (جو بھی آپ کی تھی)

۱۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء

راولپنڈی

کنول

کسی جنم میں ہمارا تمھارا ساتھ تھا۔ میں نے سنا ہے پچھلے جنم کی باتیں یاد نہیں رہا کرتیں۔ ہو سکتا ہے تمہیں بھی کچھ یاد آ سکے، اُس زندگی میں ایک بار تم نے کہا تھا ”آپ فرسٹ ڈویژن لیس تو پوری دنیا کے سامنے.....“ خیر چھوڑو اس قصے کو، بھلا بوجھو تو میری کون سی ڈویژن آئی ہوگی؟ صرف فرسٹ ڈویژن ہی نہیں..... بلکہ پوری یونیورسٹی میں میری فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔ یہ خبر ملی تو میں نے سوچا تم بھی کتنی بد قسمت تھیں، مجھ ایسے آدمی سے صرف اتنا کچھ ہی چاہا!!

ہاں یہ چار مہینے بہت کٹھن تھے۔ ان دنوں کی ساری جزئیات میں جانا میرے لیے ممکن نہیں۔ صرف یہ جان لو کہ تم کو ذہن سے باہر بھیجنے کی جستجو میں میرے سر کے آدھے بال سفید ہو گئے۔ زندہ رہنے کے لیے اپنے آپ کو نئے سرے سے ڈھونڈنا پڑا۔

تمھارا آخری خط ملنے سے پہلے میں ہر شام تمہیں ایک طویل خط لکھا کرتا تھا۔ میرے پاس ان خطوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے۔ سوچا تھا کبھی ملوگی تو دوں گا۔ میں بھی کتنا سادہ دل تھا! پھر ایک دن میں اور پردیز رشید تمھاری تلاش میں مری پہنچے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ تم ضرور مغربی میں زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جاؤ گی۔ ہم پورا دن تمہیں ڈھونڈتے پھرے۔ تھک ہار کر مال کے ایک کونے میں جا بیٹھے۔ بیس پچیس منٹ کی طویل خاموشی کے بعد پردیز نے اچانک مجھ سے پوچھا ”آج جمعرات ہے؟“ میں نے جواب دیا ”ہاں۔“ اُس نے سر پر ہاتھ مارا ”منہوس دن کام کیسے بنتا؟“ باقی چھ دن میرے لیے مُرے ثابت ہوئے۔ یوں ہم نے پورا ہفتہ غصہ منایا اور بلند یوں سے نیچے اتر آئے۔

جس دن تمھارا خط ملا، میں لاہور میں تھا۔ ساتھی مجھے بھلانے کے لیے فلم پر لے گئے۔

وہاں تمھاری کنبلی سعیدہ بیٹھی تھی۔ تم اور بھی شدت سے یاد آئیں۔ قلم سے نجات ملی تو قوم نے منم سینما کے سامنے نگوں کی دکان پر ہلہ بول دیا۔ بیٹیں سے میں تمھارے لیے پھولوں کے گجرے خریدا کرتا تھا۔ پھول بیچنے والا جب آواز لگتا، میرے سامنے تمھاری کلائی آ جاتی۔ میں نے پاس بیٹھے طارق سلطان سے پوچھا ”کوئی شخص تیس منٹ میں ہشتیس بار یاد آئے تو کیا زندہ رہتا ممکن ہے؟“ کہنے لگا ”شاید نہیں۔“ اس شام میں نے زندہ رہنے کے متعلق پہلی بار سنجیدگی سے سوچا تھا۔ پھر ایک دن تمھارا کزن معظم ملا۔ کہنے لگا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ میں نے اُس کی کار کے ارد گرد تین چکر لگائے ”جی بھر کر دیکھ لو معظم۔“ وہ ہنس پڑا، میں نے بات مکمل کی۔ ”اُسے کہتا، میں اُس کی اُمیدوں کے برعکس ابھی تک زندہ ہوں“ اور میں وہاں سے چل دیا۔ خدا جانے تم تک یہ جواب پہنچا بھی۔

میں ماضی کے صحرا سے باہر نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھا کہ شاہدہ کے واپس لوٹنے کی خبر ملی۔ یہ جولائی کے وسط کی بات ہے۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کو داخل کرانے آئی تھی۔ میں ہی جانتا ہوں، اس کے ساتھ تمھیں نہ پا کر میں نے کتنی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اُس سے گزرے دنوں کی باتیں ہوئیں۔ پھر اُس نے بتایا تمھاری مفتی خرم سے ہو چکی ہے۔ تمھاری بڑی بہن نے تھوڑی بہت مخالفت کی لیکن تم نے بڑی ہوشیاری سے سلسلہ سیدھا کر لیا۔ یوں اس انجمنی داستان کا خاتمہ ہوا جس کی ابتدا پورا ایک سال پہلے آج کے دن ہوئی تھی۔ مبارک ہو! تم نے اپنے وجود کے ٹکڑے جوڑ لیے۔ چلو تمھیں ایک ہوتا تو نصیب ہوا۔

یاد ہے کبھی تم نے ایک لڑکی نبیلہ کا ذکر کیا تھا۔ ایک تہا شام میں اداس بیٹھا تھا کہ اُس سے میری ملاقات ہو گئی۔ اس خریب نے میری بہت مدد کی۔ جب تک لاہور رہا پھر وہ میرے پاس بیٹھی تمھاری باتیں سنتی رہتی۔ ایک بار مجھے اپنے گھر بھی لے گئی۔ اُس کے ابو پروفیسر ہیں۔ یہ سبھی لوگ بہت اچھے تھے۔ ایک دن پوچھنے لگی ”آپ کو وہ بہت اچھی لگتی تھی۔“ میں نے کہا ”ہاں۔ اندازہ کرو، اب یہ عالم ہے تو پہلے کیا ہوا ہوگا۔“ پھر میں نے اُس سے پوچھا ”تمھیں کنول کی باتیں بُری لگتی ہیں؟“ کہنے لگی ”نہیں بلکہ مجھے لگتا ہے، جیسے یہ نام میرے ہی وجود کا کوئی حصہ ہو۔“ مگر کاش تم نبیلہ ہو تیں اور تمھارے ڈیڑی ابو ہوتے!

پھر ایک شام دوستوں کو کچھ بتائے بغیر چڑی لوٹ آیا۔ یہاں تھمارے ماموں کے بیٹے سے سر راہ ملاقات ہو گئی۔ اُس نے بتایا تھمارے ڈیڈی نے خرم کا خط پکڑا تھا، لیکن اس بات پر کوئی ایسا فساد نہیں ہوا۔ تم خرم سے ملنے چڑی آتی رہیں (اُس کی تبدیلی یہاں ہو گئی ہے) تھماری منگنی پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا، بلکہ انتہائی آسانی کے ساتھ تم ایک افسر سے پھسل کر دوسرے کی زندگی میں داخل ہو گئیں۔

یاد ہے کبھی تم نے کہا تھا ”میری شادی آپ سے ہوگی، ورنہ میں دنیا بھر کے سامنے آپ سے ملتی رہا کروں گی۔ خاندان نے روکا تو اُسے چھوڑ کر آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“ تم نے اپنے گفت پر یہ عبارت لکھ بھیجی تھی ”اُس کے لیے جسے میں عمر بھر نہ بھلا سکوں گی۔“ لیکن صرف چند روز بعد تم سب کچھ بھول چکی تھیں۔ تم بڑے لوگوں کی بڑی باتیں!!! داد دیتا پڑتی ہے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ عورت اپنی پوری گہرائی سے پیار کرتی ہے۔ اُس کا پیار سمندر کی طرح بے سکون اور کائنات کی مانند وسیع ہوتا ہے، جب کہ مرد کا پیار ناہموار، نریرہ اور تند و تیز طوفان کی طرح ابھرتا ڈوبتا رہتا ہے۔ اتنی لفظ بات جانے کس نے لکھی۔ مجھے دیکھو میں مرد ہوں۔ جب تک تم ساتھ تھیں، میرے ذہن میں کوئی عورت اٹھزائی نہ لے پائی۔ تم عورت ہو، لیکن تھمارے ذہن سے کار اور بنگلہ باہر نہ جاسکا۔ میں اپنی مظلومی کی قبا اتار سکا نہ تم عرش سے زمین پر آ پائیں۔ میں اپنے اندر کے انسان کو قتل کر سکا، نہ تم اسے زندہ قبول کرنے پر تیار ہوئیں۔ میں نے تمہیں زندگی سمجھا اور تم نے دولت کو۔ غلط قصے ہیں کہ محبت ہر دیوار کو گرا دیتی ہے۔ لوگوں کو بتاؤ کہ اس سماج میں محبت کے سوا ہر شے جائز ہے اور انسان کے سوا ہر چیز منگنی۔ جب تک بڑائی زندہ ہے، انسان مرتا رہے گا۔ ورنہ اس ساری دنیا کی دولت میرے ایک سجدے کی قیمت سے بھی کم تھی..... لیکن تم نے مجھے میرے سجدوں سمیت کا رستے روند دیا۔

ہم بے بس لوگوں کی زندگی بہت کڑوی ہوتی ہے۔ ڈنکوں کے زہر سے ہمیں موت نہیں آیا کرتی۔ تم نے مجھے زہر پلایا ہے نا، بھلا یہ بھی کوئی ایسی بات تھی کہ تم شرمندہ ہوتی پھرؤ؟ یہ تمہاری اپنی لاش ہے اسے پھینالو، یہ تم ہو، تھمارے اندر کا مرا ہوا انسان ہے، جس کی لاش سے تمہیں خوف آتا ہے۔ اسی کی وجہ سے تم راتوں کو کانپ اٹھتی ہو، لیکن گھبراؤ نہیں آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گی۔

پھر تمہارے ماحول میں تو پہلے ہی لاشوں کے انبار لگے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں؟ یہ لاشیں امی ہوتی ہیں، خال اور نہ ڈیڈی۔ صرف انسان کھاتی ہیں اور جب کچھ نہ ملے تو سائپ کی مانند اپنی اولاد کو بھی نگل جاتی ہیں۔ میں محسوس کر سکتا ہوں آج سے بیس تیس سال بعد تم بھی اسی طرح اپنی اولاد کو کھا جاؤ گی۔ تم نے انہی تاریکیوں میں جنم لیا تھا اور انہیں پرستیوں کی جانب واپس لوٹ گئی ہو۔ تاریکی کچھ اور بڑھی لاشوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا یہ لاشیں جلتے سراب ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ تم ان سے باہر آ سکو۔ لاشوں کی ہستی چھوڑ دو۔ لیکن تمہیں بچانہ سکا۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔

شرمندہ تو مجھے ہونا چاہیے!

چلو چھوڑ واس قصے کو تمہیں ایک نئی بات سناؤں۔ تین چار دن کی بات ہے، میں اپنے ایک دوست کو فون کرنے صدر والے پبلک آفس میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک حیرت انگیز جسم والی برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ اُس نے فون کا ڈائل گھمانے کے لیے ہاتھ باہر نکالا تو میں چونک اٹھا۔ بالکل تمہارے والے ہاتھ تھے۔ اُس نے کئی بار نمبر ملایا اور پھر خاصی پریشان حالت میں ایک جانب بیٹھ گئی۔ لمحہ بھر کے لیے میں نے سوچا۔ یہ خاتون ایسے ہاتھوں سے چائے کا صرف ایک کپ بنا دے تو کتنا بڑا معجزہ ہو۔ اُس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے آخری بار نمبر ملایا، لیکن پھر جیسے مایوس سی ہو کر باہر جانے کے لیے مڑی۔ اُس نے دو تین قدم لیے اور پھر کچھ سوچ کر ڈک گئی۔ آخر وہ میری جانب آئی اور پوچھنے لگی ”آپ یونیورسٹی میں ہوتے ہیں نا؟“ میں نے حیرت اور کہیں دور اندر جھپی مسرت کے ملے جلے انداز میں جواب دیا ”جی ہاں۔“ کہنے لگی ”میں بہت پریشان ہوں ممکن ہو تو میری کچھ مدد کیجئے۔“ میں نے مختصر جواب دیا ”فرمائیے؟“ وہ قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی اور ہال میں بیٹھے سارے لوگ ہماری جانب متوجہ ہو گئے۔ اُس نے سرگوشی کی ”دیکھئے میں لاہور سے آئی ہوں۔ میری چھوٹی بہن نیو سیمپس میں پڑھتی ہے۔ میں نے آپ کو بہت دفعہ دہاں دیکھا ہے۔ آپ کا نام راجہ صاحب ہے نا؟“

اور پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر بولنے چلی گئی ”بات یہ ہے کہ میرے چھوٹے بھائی اور نوکر دونوں کو پولیس نے آوارہ گردی میں گرفتار کر لیا ہے۔ یہاں کا ایک پولیس انسپکٹر ہمارا واقف ہے۔ وہ فون پر نہیں ملا۔ آپ انہیں چمڑا دیجئے۔“ میں کوئی جواب دیئے بغیر اٹھا اور متعلقہ تھانے

میں فون کیا۔ اتفاق سے تھانیدار واقف نکل آیا۔ میں نے کہا ”گلتا ہے جیسے دال، پیاز کی طرح مجرموں کی بھی کوئی قلت پیدا ہو گئی ہے۔ میری ایک کلاس فیلو کے بھائی لاہور سے سیر کے لیے آئے تھے آپ نے انھیں نوکر سمیت اندر کر دیا۔“ اُس نے نام پوچھا ”نام بتائیے، ابھی پتہ لگا لیتے ہیں۔“ میں نے فون پر ہاتھ رکھا اور پاس کھڑی خاتون سے کہا ”اُن کے نام۔“ وہ آہستہ سے بولی ”ایک کامیئر اور دوسرے کا مکھن۔“ میں نے فون پر یہی نام دہرا دیے۔ تھانیدار زور سے ہنس پڑا ”رہبر صاحب کمال کرتے ہیں۔ کسی نے آپ سے مذاق کیا ہوگا۔“ میں نے ذرا ساجران ہو کر کہا ”نہیں جی، ان کی حاجی یہیں کھڑی ہیں۔“ تھانیدار نے پوچھا ”اُن کا نام فرزند تو نہیں۔“ میں نے اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ جواب دیا ”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“ تھانیدار نے کہا ”مجھ سے سنئے وہ لاہور کی ایک طوائف ہے۔ اُس کا نام فرزند ہے۔ یہ دونوں آدمی اُسی کے ہیں۔“ میں نے عورت کی جانب غور سے دیکھا جو میری موجودہ ذہنی کشش سے بے خبر اس انتظار میں تھی کہ میں اُسے کب خوشخبری سناتا ہوں۔ میں نے ذرا بھر توقف کیا اور پھر تھانیدار سے کہا ”دیکھئے آپ انھیں چھوڑ دیجئے تو مجھ پر احسان ہوگا۔ ورنہ پرچہ کاٹ دیجئے تاکہ ان کی منات کا کوئی بندوبست ہو سکے۔ آپ نے گرفتاری کرنا ہے تو کسی اسمگلر کو پکڑیے، کسی جاگیردار کو اندر کیجئے۔ کسی سرمایہ کار کی کھال کھینچئے۔“ میں نے گپ لگاتے ہوئے کہا ”ویسے میں آج کل تعلیم سے فارغ ہو چکا ہوں، اگر آپ چاہیں تو بے روزگاری کا یہ زمانہ اندر گزارنے کو تیار ہوں۔“ تھانیدار بہت معقول قسم کا آدمی تھا۔ اُس نے آدمی چھوڑ دینے کا وعدہ کیا۔ میں نے فون رکھا اور اُس سے کہا ”خاتون آپ چاہئے۔ آپ کے آدمی آجائیں گے۔“ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ ”نہیں آپ میرے ساتھ چلیں۔ چائے کا ایک کپ پی کر واپس آجائے گا۔“ میں اب اُس کے احسان مند ہاتھوں سے چائے پینے کے لیے تیار نہ تھا۔ ”دیکھئے مجھے فون کا انتظار ہے۔“ اُس نے پورے اطمینان سے کہا ”میں اتنی دیر ٹوک جاؤں گی۔“

فون سے رہائی ملی تو میں نے دوبارہ اس سے معذرت چاہی۔ لیکن اُس نے ایک نہ سنی۔ ”نہیں آپ کو چلنا ہوگا۔“ ہم ٹیکسی پر بیٹھے اور ایک اوّل درجے کے ہوٹل میں پہنچے۔ میں اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک خوبصورت سے سبے سہائے کمرے میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے

مجھے تمھارے والے ہاتھوں سے چائے بنا کر دی۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے خود کو ماضی کے سمندر میں ڈوبتا ہوا پایا، لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ اُس نے پندرہ منٹ کی خاموشی سے جیسے اُکتا کر کہا ”میں طوائف ہوں۔“ میں نے کہا ”ہاں جانتا ہوں۔“ پوچھنے لگی ”آپ نے تعلیم مکمل کر لی؟“ میں نے اُسی انداز میں جواب دیا ”جی ہاں یوں ہی سمجھ لیجئے۔“ خاصی سمجھ دار اور پڑھی لکھی عورت لگتی تھی۔ اُس نے دوبارہ خاموشی کو روندتے ہوئے کہا ”نیکو کیس میں آپ کے ساتھ ایک سارٹ سی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ میں نے کہا ”ہاں کبھی ہوا کرتی تھی اب صرف ماضی کی ایک یاد ہے۔ رشتہ تو اُس نے کسی اور سے جوڑ لیا۔“ پھر تمھارے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں۔ میں نے موضوع بدلنے کے لیے اُس کی بہن کے متعلق پوچھا۔ کہنے لگی ”میری کوئی بہن نہیں۔ یونیورسٹی میں ایک لڑکا ہے۔ اعجاز نام ہے۔ میں اُسی کے ساتھ شام کے وقت کیسپس والی سڑک پر آیا کرتی تھی۔ وہ سڑک ذرا دیران ہی ہے نا، ہم گاؤں کے ساتھ اکثر اُسی طرف جایا کرتے ہیں۔ اعجاز نے آپ کا نام بتایا تھا۔ ہم کار پر ہوتے تھے، اس لیے آپ نے نہ پہچانا ہوگا۔“ تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ روم میں چلی گئی۔ میں نے تیسری پیالی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے سوچا۔ وہ باہر آئے تو اجازت لوں۔ میں نے یونہی اخبار اٹھایا اور وزیروں کی تصویریں دیکھنے لگا۔

وہ باہر آئی تو انڈر ویر اور انگلیا کے سوا اُس کے جسم پر کوئی غلاف نہ تھا۔ حمیں یاد ہے نا میں ایسے مناظر پر بھڑکا نہیں کرتا، لیکن اس لمحے میں نے خود کو ذرا سا ہلٹے پایا۔ ذہن نے قلابج بھری لوگ بھی کتنے ظالم ہیں جو اسے خوبصورت اور پُرکشش جسم کو نوچتے ہوں گے۔ اُس نے انڈر ویر کرسی پر پھیلتے ہوئے کہا ”آجایئے۔“ میں نے تین چار قدم لیے اور اُس کے قریب پہنچ گیا۔ ”نہیں میں بہت عجیب آدمی ہوں، میں انسان کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ میں اجنبی ہوں۔ بالکل اور طرح کا انسان۔“ خاتون حیران سی ہو گئی ”آپ نے میری بہت مدد کی ہے میں اس کا معاوضہ دینا چاہتی ہوں۔“ میں نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ”میں آپ کے ہاتھ سے چائے کا صرف ایک کپ پینا چاہتا تھا۔ آپ نے تین پلا دیئے اس سے اچھا معاوضہ اور کیا ہوگا۔ میرے لیے آپ کا جسم بہت مقدس ہے۔ میں اسے ناپاک نہیں کر سکتا۔“ عورت ابٹھ کر بیٹھ گئی ”کتنی عجیب باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں تو بہت گناہ گار ہوں۔ طوائف ہوں نا۔“ میں اُس کی سادگی پر مسکرا دیا۔

”اس دنیا میں ایسی شریف عورتیں بھی ہیں جو کار، انٹری اور دولت کے لیے دوسروں کو ذبح کر دیتی ہیں۔ روپے تو کبھی عورتیں لیتی ہیں۔ اگر آپ صرف اسی وجہ سے طوائف ہیں تو پھر یہ کبھی مرد اور عورتیں آپ سے زیادہ گناہ گار ہیں اور آپ ان سب سے بہت اچھی ہیں۔ آپ نے یہاں آتے وقت پیار کا دعویٰ نہیں کیا۔ نہ مجھے چھوڑتے وقت آنسو بہائیں گی اور نہ بعد میں مجھے دھوکا دیں گی۔ آپ جو کچھ ہیں، سب کے لیے سب کے سامنے ہیں۔ مجھے آپ کا احترام ہے کہ آپ مجبور ہونے کے باوجود بہت پوتر ہیں۔ میں آپ سے صرف باتیں کر سکتا ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ آپ کا جسم لٹتا ہے اور میری محنت..... ہمیں تو ایک دوسرے کی مجبور یوں کا احساس ہونا چاہیے۔“

اُس نے بتایا اُسے یاد نہیں کہ کتنے لوگ اُس کے ساتھ سوچکے ہیں۔ اُس نے کسی سے پیار نہیں کیا نہ کسی نے اُس سے..... پھر میں نے اُس سے پوچھا ”آپ پر لوگ روپے کی پرستش کا الزام دیتے ہیں۔ فرض کیجئے کوئی مجھ سا غریب آدمی آپ کے قدم چومے، بہت زیادہ پیار کرے، آپ پر کوئی پابندی بھی نہ لگائے، آپ اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔“ کہنے لگی ”اُسے کبھی نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ سٹ کر میرے اور قریب آگئی۔ پھر اُس نے سادگی سے کہا ”آپ مجھے تم کہیں نا، پلیز۔“ میں نے بات جاری رکھی۔ ہاں تو پھر تم بتاؤ نا وہ عورت مجھے کیوں چھوڑ گئی۔“

تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے اُس کے ہاتھوں کو آخری بار سہلایا اور کہا ”اب اجازت دو، مجھے کہیں جانا ہے، شام ہونے والی ہے۔“ تمہیں بھی اپنے دھندے پر لکھنا ہوگا۔ ہمیں اپنی مجبور یوں میں اور اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ اٹھ کر میرے قدموں سے لپٹ گئی ”میں طوائف ہوں، میں پیار کے لفظ سے آشاہی نہیں۔ اس قابل بھی نہیں کہ آپ سے پیار کر سکوں۔ میں آج کی رات کہیں نہ جاؤں گی، مجھے صرف ایک رات کا سکون چاہیے۔ میں اپنی خوشی سے آپ کو رکھنا چاہتی ہوں۔ دیکھئے پلیز۔“ میں نے آہستہ سے اُسے اٹھایا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اُس کے مقدس ہونٹ چوم لیے اور پھر اُس کے سامنے جھک گیا۔

صبح جب بیدار ہوا تو فرزند انتہائی سکون سے میرے پہلو میں سو رہی تھی۔ میں نے اُس کے منہ میں جسم کو آخری بار چوما۔ کپڑے پہننے ہوئے میری نظر اُس کے چہرے پر گئی تو اچانک مجھے

خیال آیا "زندگی بھی کیا حادثہ ہے۔ شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں، بارش کے قطروں کی مانند، ایک سمندر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جُدا! قربتوں کے قاصد کبھی طے نہیں ہو سکتے۔" میں یہی کچھ سوچتے وہاں سے باہر نکل آیا۔

راستے میں مجھے احساس ہوا۔ میں خدا ہوں۔ میں نے تمہارا بُت بنایا تھا۔ تم ٹوٹ گئیں، مرا خدا ہونا مجھ سے نہیں چھٹا۔ میں چاہوں تو کسی بھی پتھر کو تراش کر تم سا حسین بت بنا دوں۔ پھر اس میں اپنی سوچوں کی رُوح پھونک دوں، یہی وہ راز تھا جو فرزانہ مجھے بتا گئی۔ ہاں تمہارے ٹوٹ جانے کا مجھے بہت دکھ ہے۔ میں نے اپنی پوری دنیا تمہارے بت میں رکھ دی تھی۔ جہاں کہیں تمہاری صورت کا پرتو مل جائے، میرے درد نازہ ہو جاتے ہیں۔ میں اپنا تیشہ کندھے پر لٹکائے میٹھا سوچ رہا ہوں کہ کوئی ایسی تخلیق کروں جو تمہارے ٹوٹ جانے کے درد سے آزار نہ کر دے۔ لیکن اب بُت بنانے سے پہلے مٹی ضرور چاٹ لیں گے۔

جانتی ہو زندگی ایک ادھورا سفر ہے۔ تم مل بھی جاتیں تو کیا شب و روز کے ملنا بچے بچہ جاتے۔ صرف چند سالوں بعد تمہارا حسن ضعف کے ہادلوں میں ڈوب جاتا اور میری تمناؤں، میری خفیدہ کمر سے زیادہ جھک گئی ہوتیں۔ پھر کسی اداس شام ہم آسمان سے ٹوٹتے ستاروں کی طرح ایک ایک کر کے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ تم نے مل بھر کے اس وقفے میں جنگوں سے اپنی تکمیل چاہی اور میں نے تم سے۔ ہم دونوں ہی غلط تھے۔ مجھے تو احساس ہو گیا، تمہیں شاید کبھی ہو جائے۔

ہم تم تاریخ کے ایسے اُفق پر پیدا ہوئے جو اندھیروں اور اُجالوں کا سنگم ہے۔ پرانی قدروں کے اندھیرے اور نئی سوچوں کے اُجالے میں جنگ جاری ہے۔ ایک جانب مرنے والوں کا ماتم ہے اور دوسری جانب پیدا ہونے والوں کی خوشی میں شادیاں لے۔ ہر جانب ایک کہرام برپا ہے۔ آوازوں کے اس شور میں کچھ سناٹی نہیں دیتا۔ کوئی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ تم اپنا دوپٹہ ہاتھوں میں اٹھائے مرنے والوں پر شاید بین کر رہی تھیں، میں سمجھا تم نے نئی سوچوں کا پرچم تھام رکھا ہے۔ تاریخ کے ان گہرے دھندلکوں کے غبار میں تمہارے چہرے پر موجود کرب نزع بھی نہ دیکھ سکا۔ میں تمہیں اپنا ہم سفر جان بیٹھا اور آوازوں کے اس محشر کے درمیان کھڑا تمہیں بتاتا رہا۔ نئی دنیا کی

ہاتھیں، جب اجالے ہوں گے، جب انسان اپنی انسانیت کے حوالے سے پہچانے جائیں گے۔ تم سر ہلاتی رہیں، جیسے سب کچھ بھرنی ہو۔ ان ہی ہنگاموں میں تم مرنے والوں کے گروہ میں شامل ہو گئیں اور میری آنکھوں کے سامنے تم نے جان دے دی، مجھے ان سارے مرتے ہوئے لوگوں میں سے صرف تمہاری موت کا دکھ ہے۔ میں تمہیں نہ بچا سکا۔ میں دھند لکھوں کے دور کا انسان ہوں نا، ادھر اور انسان..... مجھے معاف کر دینا۔

تم میری زندگی سے نکل گئیں اور میں نے بھی پرانی عقیدتیں ماضی کی قبر میں اتار دی ہیں۔ تم عیسیٰ بن کے آؤ تو بھی کبھی انہیں زندہ نہ کر سکو گی۔ تم نے میری مفلسی کی پینچہ پر لٹ مار دی تھی۔ اب ساری کائنات تھکیت کر میرے قدموں میں رکھ دو تو بھی نہ پلٹوں گا۔ تم بے فکر رہو۔ میں ماضی کے حوالے سے تمہیں کبھی نہ ملنے آؤں گا..... کہ میں پیچھے سے آواز نہیں دیا کرتا۔ ہاں میں تم سے اب بھی نفرت نہیں کرتا۔ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ یہ میری اپنی مجبوری ہے کہ میں اپنے ماضی سے متنفر نہیں ہونا چاہتا۔ میں تمہیں نہیں بھلا سکا..... لیکن میں تو اس فقیر کو بھی نہیں بھلا سکا، جو بچپن میں ہمارے گھر کے سامنے صدا گایا کرتا تھا۔ زندگی کو دیکھنے کا اپنا اپنا انداز ہے۔

محبت ایک پاکیزہ اور مقدس جذبہ ہے۔ میرا گناہ یہ نہیں کہ میں نے پیار کیا ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں نے پتھر کی مورت کو دیوی بنا دیا۔ سب مرمر کے بت کو انسان جانا۔ میں نے اُن آنکھوں میں وفا ڈھونڈنا چاہی، جو سونا اور چاندی دیکھنے کی عادی تھیں، جو شاید محبت کی پہچان ہی سے عاری تھیں۔ میں نے اُس سماج میں محبت کو ڈھونڈنا چاہا، جہاں ڈھونڈنے سے خدا بھی نہیں ملتا۔ میں جو دنیا کو بتایا کرتا تھا، خود بھول گیا کہ دھن والوں کی لغت میں محبت نام کا کوئی لفظ نہیں ہوتا۔ اُن کے نزدیک انسان سے محبت ایک بے معانی استعارہ ہے۔ وہ صرف اپنے آپ سے پیار کرتے ہیں۔ دولت کی زبان سمجھتے ہیں اور جب تک سماج پر دولت کا راج رہے گا محبت میں کامیابی بھی ناکامی ہے اور ناکامی بھی ناکامی!

میں تمہیں نہ تو ماضی کے وعدے یاد دلاؤں گا اور نہ وقتِ وداغ کی قسمیں، تاکہ تم بھولی ہوئی داستان کو مکمل طور پر فراموش کر سکو۔ لیکن تمہیں اتنا ضرور بتانا چاہوں گا کہ تم نے ایک اور شخص کو کھائی ہے۔ زمانہ کروٹ لے چکا۔ تمہارے امیران شہر کا سورج گہنا گیا ہے۔ اُن کی خاندانی

دجائیں آخری لہکی لینے کو ہیں۔ اُن کی افسریاں دم واپس پر ہیں۔ اُن کی داغ دار عظمیتیں آخری سانسوں پر ہیں۔ لیکن تم نے سدا کے اندھوں کی مانند، عالم نزع سے دوچار اس طبقے کے ایک اندھے کا ہاتھ تھما اور رات کے اندھیاروں میں کھو گئیں۔ تم اُس کشتی پر سوار ہو گئیں، وقت جس کا پتہ اچھلتی کر چکا ہے۔

ہم آوارہ منش دیوانے لوگ، ہر کاج سے آج بے کار سہی، لیکن ہمارے دل کبے کی مانند مقدس اور دولت کے لات منات سے پاک ہیں۔ تم اس کبے میں داخل تو ہو گئیں، لیکن تم نے دولت کے بت اپنی بفلوں سے نہ گرائے۔ انسان کی بجائے عہدے، ایشیٹس اور رُجے کی تنہا کبھی تمہارے دل سے نہ گئی۔ لیکن یاد رکھو، روزِ محشر قریب ہے، جب آتش فشاں آگ اُٹھیں گے۔ بھونچال اور زلزلے آئیں گے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ کہیں امان نہ ملے گی۔ سماج کے ہتھ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ آج جن کا حراج عرش بریں پر ہے، وہ زمین پر پناہ ڈھونڈتے پھریں گے۔ جو آج ہمارے کندھوں پر سوار ہو کر چلتے ہیں، انہیں ہماری طرح اپنے پاؤں پر چلنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ زمین پر رہنا پڑے گا۔ اور یہ تبدیلی تم اپنی زندگی ہی میں دیکھو گی۔

اور جب نئی زندگی، نئی دنیا کا سورِ طلوع ہوگا، تو انسان پہلی بار سکھ کا سانس لے پائے گا۔ انسان کو محبت کرنے کی آزادی ہوگی۔ پھر کوئی شخص میری مانند محبت کی بازی ہارے گا اور نہ کوئی امیر زادی تمہاری طرح دامنِ جھٹک کر راہ بدلے گی۔ پھر کسی کی محبت کا خرمن بٹلے گا اور نہ کسی کو میری مانند محرومیوں کا زہر پینا پڑے گا۔

حبِ نیک کے لیے خدا حافظ!!

۱۷ اپریل ۱۹۷۷ء

راولپنڈی

بیگم صاحبہ

آج تمہیں لاہور سے واپس لوٹے پورا ایک سال ہو گیا۔ آج ہی کے دن تم مجھ سے چدا ہوئی تھیں، اور آج ہی کے دن تمہاری شادی ہے۔ کیسا عجیب اتفاق ہے۔

آج تمہاری شادی ہے۔ سو چتا رہا، سو چتا رہا، خوشی کے اس موقع پر تمہیں کیا پیش کروں؟ میں حیدرست فلسفی، مجھ میں کوئی اچھا سا تحفہ خریدنے کی سکت کہاں؟ میری کل کائنات میرے اُچھوتے خیالات ہیں۔ میری ساری جائیداد میرا شعور اور میری دولت یہ چند الفاظ ہیں..... خوشی کے اس موقع پر میں اپنی ساری دولت اس کتاب کی شکل میں تمہیں پیش کرتا ہوں۔

تم نے ایک بار خود کہا تھا، ان خطوط کو شائع کرا دینا چاہیے۔ تمہاری خواہش تھی کہ دنیا تمہیں میرے حوالے سے جانے۔ میں نے تمہاری یہ آخری خواہش بھی پوری کر دی۔ اب تمہیں لوگ میری وجہ سے جانیں گے۔ تمہیں اس کتاب کے ذکر سے پہچانیں گے اور پھر وہی فیصلہ کریں گے کہ زندہ رہنے کا حق مجھے غریب کا تھا، جس نے محبت کی، یا تم امیر زادی کا جس نے پیار کو ٹھکرا کر دولت اور افسری کو چتا۔ لوگ فیصلہ کریں گے کہ ہم میں سے کون صحیح تھا اور غلط کون۔ ہم دونوں مرتبھی جائیں گے تب بھی..... یہ مقدمہ لوگوں کی عدالت میں چلتا رہے گا۔ ہر دور کے انسان اس پر اپنا اپنا فیصلہ دیتے رہیں گے۔

مجھے یقین ہے یہ تحفہ تمہیں ہمیشہ عزیز رہے گا۔ تم فخر سے اپنی ہم جویوں کو بتا سکو گی کہ تم پر کتاب لکھی ہے۔ آخر ہر حسین امیر زادی پر کتاب تو نہیں لکھی جاتی۔ اس لیے تمہارے طبقے کی ساری عورتیں عمر بھر تمہیں رشک سے دیکھا کریں گی۔ تم اس تحفے کے ذریعے اپنے خاوند کو بھی اپنی اہمیت کا احساس دلاتی رہو گی۔ تم اُسے بتا سکو گی کہ تم نے اس کے لیے کتنے لوگوں کو روکیا ہے۔

خاوند اور محبوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تم بیوی بنی ہو، جلدی ہی یہ فرق تم پر واضح ہو جائے گا۔ لیکن اس تجھے کی بدولت خاوند عمر بھر تمہارا غلام رہے گا۔

..... اور جب تم یوڑھی ہو جاؤ گی، جب یہ پرکشش آنکھیں بے نور ڈھیلوں میں ڈھل جائیں گی۔ جب یہ سیاہ زلفیں مٹھی بھر سفید چٹپٹا میں بدل جائیں گی، جب اس حسین جسم پر آجائے ویرانوں کا گمان ہوگا۔ خزاؤں کا راج ہوگا۔ جب تمہاری ٹھوڑی کا حسین گل ڈھلک کر سیاہ و جبے کی شکل اختیار کر لے گا اور جب تمہارے چہرے پر جھریوں کا جھرمٹ ہوگا..... جب یہ کتاب تمہارا واحد سہارا ہوگی۔ تم اپنی نواسیوں سے پڑھو پڑھو کر یہ الفاظ سنا کرؤ گی۔ بیٹے وقت کو یاد کرؤ گی اور شرمندہ بھی ہوگی۔ جس کی مجھے خواہش ہے نہ تم سے توقع۔ تمہاری نواسیاں بھی فخر سے لوگوں کو بتا سکیں گی کہ ثانی اماں اپنے وقت کی کتنی عظیم خاتون تھیں! میں اُس وقت منوں مٹی تھے دبا ہوں گا، تمہاری دعاؤں اور بددعاؤں سے بہت دور!

تھیں یہ کتاب پڑھ کر خوشی ہوگی اور دنیا کی عبرت۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد کوئی غریب کسی امیر سے داستان محبت نہ چھیڑے گا۔ پھر کوئی مفلس تم امیروں کے سحر میں گرفتار نہ ہوگا۔ پھر کوئی جموہیتوں کا کہیں، محلات سے رشتہ و فائدہ نہ باندھے گا..... میری غلطی نہ دہرائے گا۔ کسی جال میں نہ آئے گا..... اس طرح جانے کتنوں کا بھلا ہوگا۔

ہو سکتا ہے، قبریں پھٹ جائیں اور لاشیں اپنے کفن سمیت باہر آجائیں۔ یہ بھی ممکن ہے مجھے زہر پینے پر مجبور کر دیا جائے۔ میرے ہاتھ قلم کر دیئے جائیں یا میری زبان کھینچ لی جائے۔ کیونکہ میں نے سچ کہہ دیا ہے۔ ایک بڑے آدمی کی بیٹی مجھ چھوٹے انسان سے منسوب ہو گئی ہے اور لاشیں زسوا ہو گئی ہیں۔ محلات کی قبروں میں بسنے والوں کو یہ کہہ دینا، مجھ غریب نے صدیوں سے اُن کی نا انصافیوں کا قرض اُٹھا رکھا تھا۔ یہ پہلی قسط ہے۔ شرمندہ ہوں کہ صرف اتنی ادائیگی ہی کر پایا، باقی حساب ہماری نسلیں آپس میں طے کر لیں گی!.....!

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
 - ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
 - ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
 - ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
 - ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
 - ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
 - ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
 - ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
 - ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
 - ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
 - ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
 - ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
 - ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

جھوٹے روپ کے درشن

”میرا یقین ہے کہ جو لوگ انسانوں کے جبلی اور بنیادی جذبات کی قدر کرنا نہیں جانتے وہ ادھورے لوگ ہوتے ہیں چاہے وہ بہت بڑے مصلح ہوں، چاہے بہت بڑے انقلابی۔ راجہ انور کی تازہ تصنیف پڑھ کر مجھے اس لیے خوشی ہوئی ہے۔ نہ جانے مستقبل کے لیے اس نوجوان کے کیا ارادے ہیں، لیکن اگر اس نے سیاسی لیڈر بننا پسند کیا تو یہ ایک ایسا لیڈر ہوگا جسے دیکھ کر نہ ہنسی آئے گی نہ اس سے ڈر لگے گا۔ بلکہ اس پر پیار آئے گا کیوں کہ اس نے پیار کی تمام پرتوں اور مرحلوں کو اپنے خون میں کھپا کر اپنی شخصیت کا ناگزیر حصہ بنا لیا ہے۔“

احمد ندیم قاسمی

13 مارچ 1974ء



Published by:
Jahangir Books

Buy online:

www.jworldtimes.com
www.jbdpress.com

ISBN: 978-969-573-334-9



READING
Section

